مجلّہ طلوع اسلام کا اجراء 1938ء میں علامہ اقبالؒ کے ایما اور قائداعظمؒ کی خواہش پر عمل میں آیا۔

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوع اسلام

ماہنامہ ______ لاہور

انتظامیہ ادارہ طلوع اسلام

چیئرمین:- بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) اعزاز الدین احمد خاں
ناظم:- محمد لطیف چوہدری

مدیر مسئول:- محمد لطیف چوہدری
مجلس ادارت:- میجر محمد یوسف ڈار۔ محمد عمر دراز
ناشر:- عطاء الرحمٰن ارائیں
طابع:- خالد منصور نسیم
مطبع:- النور پرنٹرز و پبلشرز
3/2 فیصل نگر ملتان روڈ لاہور۔ 54500

مقام اشاعت:- 25-B گلبرگ 2 - لاہور۔ 54500

خط و کتابت

ناظم ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ)
25 بی گلبرگ۔ 2 لاہور 54660
ٹیلی فون : 876219
فیکس : 42-876219

فہرست مشمولات

لمعات	ادارہ	2
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ	بشیر احمد عابد	6
روزے کا مقصد	علامہ غلام احمد پرویز	14
غیر مذہبی باتیں	منظور احمد (ناروے)	20
فکر پرویز کی اصل قدر و قیمت	ابو منیب راشد	24
روزے کے احکام	علامہ غلام احمد پرویز	43
ایک ملاقات	عظمت ناز	48
سلسلہ فریضہ رسالت	محمد عمر دراز	54
کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟	علی احمد چدھڑ	61
SALAT	ادارہ	78
FASTING	ادارہ	80
BOOK REVIEW: THE PAKISTAN IDEA - S.A.		76

جلد 48 شمارہ 2 فروری 1995ء

بدل اشتراک

فی پرچہ -/10 روپے اندرون ملک سالانہ 120 روپے بیرون ملک: 18 امریکی ڈالر

لمعات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

1- غریب کی روٹی

اقوام متحدہ کے ترقیاتی ادارے کے خصوصی مشیر اور پاکستان کے سابق وزیر خزانہ ڈاکٹر محبوب الحق نے روزنامہ نوائے وقت کو خصوصی انٹرویو دیتے ہوئے دو ٹوک اور واضح الفاظ میں کہا ہے کہ پاکستان کو اس وقت ایک نہیں بلکہ کئی بحرانوں نے جکڑ رکھا ہے' جس کی وجہ سے سماجی ناانصافیاں بڑھ رہی ہیں اور ملک کا ہر ادارہ مستحکم ہونے کے بجائے تباہ ہو رہا ہے۔۔ انہوں نے کہا معاشی ناانصافی اور مالیاتی و انتظامی ڈسپلن نہ اپنانے کی وجہ سے بہت ساری قیمت ادا کرنا پڑتی ہے جو ہمیں ادا کرنا پڑ رہی ہے۔

ڈاکٹر محبوب الحق صاحب کی تجویز یہ ہے کہ پاکستان میں فوری طور پر نئی زرعی اصلاحات لائی جائیں تاکہ معاشی نظام درست ہو۔ اور کسی غریب کا معاشی استحصال نہ ہو سکے۔

یہ 1964ء کی بات ہے فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صدر پاکستان تھے۔ جناب غلام احمد پرویزؒ سے بالمشافہ گفت و شنید میں اسلام کے بنیادی اصول معلوم کر رہے تھے۔ پرویزؒ صاحب نے بتایا کہ:

"غریب کی روٹی مہنگی نہ کرنا۔ عزّتِ نفس اور بنیادی ضروریاتِ زندگی فراہم کرنا۔ بس یہی اسلام کی بنیاد ہے"۔ (طلوع اسلام مارچ 1989ء)

چشمِ فلک نے دیکھا کہ جب تک صدر ایوب نے اس اصول پر عمل کیا وہ ہر دل عزیز رہے اور ان کی حکومت بھی عوام میں مقبول رہی' لیکن جونہی غریب کی روٹی مہنگی ہوئی ایوب خاں کی حکومت اپنی بنیادوں پر قائم نہ رہ سکی۔ اور صرف "روٹی کپڑے اور مکان" کے سلوگن پر ایک نئی جماعت برسر اقتدار آگئی۔ حیرت کی بات ہے کہ اس حکومت کے زوال کا سبب بھی بنیادی طور پر یہی تھا کہ "غریب کی روٹی' مہنگی ہو گئی تھی"۔ وہی پارٹی اب پھر برسر اقتدار ہے اور اس کی سابقہ حکومت کے ایک ذمہ دار فرد اور اقوام متحدہ کے ترقیاتی ادارے کے 'خصوصی مشیر' نے توجہ دلائی ہے کہ ملک کا ہر ادارہ مستحکم ہونے کے بجائے تباہ ہو رہا ہے اور اس کا بنیادی سبب معاشی ناانصافی ہے۔

علامہ پرویزؒ نے جو مشورہ صدر ایوب خان کو دیا تھا اس کو دہراتے ہوئے ارباب اختیار کو یہ بتانا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ معاشی انصاف مدنظر رکھنا اور بنیادی ضرورتوں کو غریب کی دسترس سے باہر نہ ہونے دینا۔ یہ دین اسلام کی بنیاد بھی ہے اور کسی حکومت کے استحکام کی اساس بھی۔ ایک عام آدمی کو اس سے غرض

نہیں ہوتی کہ ملک کی خارجہ پالیسی کیا ہے۔ زر مبادلہ کے ذخائر کتنے ہیں۔ حکومت کے بڑے بڑے منصوبے کیا ہیں۔ دفاعی ضروریات کس طرح پوری ہو رہی ہیں۔۔۔۔ کس ملک سے قرض لیا جا رہا ہے یا کس کو دیا جا رہا ہے۔ عوام کے مسائل روٹی' کپڑے' مکان' تعلیم' صحت اور بنیادی ضروریات زندگی تک محدود ہوتے ہیں۔ جو حکومت عوام کی بنیادی ضرورتوں کا خیال رکھتی ہے' پائیدار اور مستحکم رہتی ہے۔۔ جناب محبوب الحق صاحب نے جن بحرانوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور جس طرح ملک کے ہر ادارے کی تباہی کی طرف جو توجہ دلائی ہے اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ 'غریب کی روٹی مہنگی' ہو گئی ہے۔ جن افراد کی وجہ سے یہ مہنگی ہوئی ہے' وہ اس قدر مضبوط ہیں کہ حکومت یا تو بے بس ہو کر رہ گئی ہے' یا اس کی سیاسی مصلحتوں نے غفلت کا روپ دھار لیا ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ چند سیاسی شخصیتوں یا جاگیرداروں نے فرضی ناموں کے ساتھ کروڑوں روپوں کی مالیت کی زمینیں ہتھیا رکھی ہیں۔ وزارت صنعت و تجارت و معاشی امور کے اپنے سروے کے مطابق یہ لوگ ایک سو بیس ارب روپے مجرمانہ طور پر ہڑپ کر گئے ہیں' جس میں سے وہ ایک روپیہ بھی ٹیکس نہیں دیتے جبکہ اصولی طور پر انہیں چالیس ارب روپے کے ٹیکس دینے چاہئیں۔

پاکستان کی معاشی عدم استحکام اور لاینحل مسائل کا حل صرف اور صرف یہ ہے کہ ملک کے نظام سے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا سایہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔ یہ لوگ صرف آج ہی "آپے سے باہر" دکھائی نہیں دے رہے' ہر دور اور ہر زمانے میں ان کا طریق یہی رہا ہے کہ رزق کے جو سرچشمے اللہ نے تمام بنی نوع انسان کے لئے مفت مہیا کئے تھے اور سب کی ضرورت پوری کرنے کے لئے تھے ان پر یہ بااثر لوگ قبضہ کر کے بیٹھ جاتے ہیں اور اس طرح انسان کی مجبوریوں کو ایکسپلائٹ (Exploit) کر کے انہیں اپنا غلام بنا لیتے ہیں۔ ہر نبی کی دینی تعلیم یہی تھی کہ ان کے خلاف 'جہاد' کیا جائے جب تک یہ ناسور کسی معاشرے میں رہتا ہے وہ معاشرہ پنپ نہیں سکتا۔ حکومت کو جناب محبوب الحق صاحب کی تجاویز اور خدشات پر فوری اور خصوصی توجہ دینی چاہئے۔ حکومت کی اپنی سروے رپورٹ کے مطابق صرف ایک سال کی مختصر سی مدت میں اشیائے خوردنی کی قیمتیں ڈیڑھ سو گنا بڑھ چکی ہیں۔ یہ صورت حال عوام کی قوت برداشت کی انتہا ہے اگر غریب کے منہ سے اس کا نوالہ بھی چھین لیا گیا تو وہ ایسی تخریب کاری میں پناہ ڈھونڈ لے گا جو ملک کی تباہی پر منتج ہو گی۔ روٹی' کپڑے اور مکان کے وعدوں پر برسر اقتدار آنے والے حکمرانوں کو اس وقت کا انتظار نہیں کرنا چاہئے جب ملک کی تعمیر و ترقی کا پہیہ گھمانے والے محنت کش یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

اور یہ کہ

سلطانئ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

2- رمضان ---- یا قوت برداشت کا امتحان

جس وقت یہ پرچہ آپ کے ہاتھ میں ہو گا ماہ رمضان شروع ہو چکا ہو گا۔ سالہا سال کا مشاہدہ ہے کہ ماہ رمضان جو اہل ایمان کے لئے انتہائی مقدس اور اہم مہینہ ہے غریبوں کی قوت برداشت کا امتحان بن جاتا ہے۔ اشیائے صرف انتہائی مہنگی ہو جاتی ہیں حالانکہ ایک مسلم معاشرے میں بات اس کے برعکس ہونی چاہئے۔ چیزوں کو مثالی طور پر سستا ہو جانا چاہئے تاکہ ایک عام آدمی بھی سکون اور اطمینان قلب سے 'فریضہ صوم' کی ادائیگی سے عہدہ براء ہو سکے۔ حکومت نے یو ٹیلیٹی سٹورز کے ذریعے دس فیصد کم نرخ پر اشیاء صرف فروخت کرنے کا اعلان کیا ہے جس پر روزنامہ جنگ لاہور نے 11 جنوری کی اشاعت میں اپنے اداریتی کالموں میں تبصرہ کیا ہے۔ ہم اس سے اتفاق کرتے ہوئے ذیل میں اسے من و عن درج کر رہے ہیں۔

"اقتصادی رابطہ کمیٹی نے اسلام آباد میں اپنے ایک اجلاس میں فیصلہ کیا ہے کہ رمضان المبارک میں یو ٹیلیٹی سٹورز پر اشیائے صرف کی قیمتوں میں 10 فیصد تک کمی کر دی جائے گی۔ اس وقت ملک میں مہنگائی کی ایک خوفناک لہر آئی ہوئی ہے جس نے غریب آدمی کا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ وفاقی اور صوبائی حکومتیں تمام تر وعدوں اور دعوؤں کے باوجود مہنگائی پر کنٹرول نہیں کر سکیں۔ پرائس کنٹرول کمیٹیاں قطعی ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ اقتصادی رابطہ کمیٹی کا فیصلہ کئی لحاظ سے محل نظر ہے۔ فیصلے کے مطابق صرف یو ٹیلیٹی سٹورز پر بعض اشیائے صرف کی قیمتوں میں 10 فیصد کمی کی جائے گی۔ ایک تو یو ٹیلیٹی سٹورز پر کئی اشیاء کا معیار بازار میں ملنے والی اشیاء سے کہیں زیادہ پست اور کم تر ہوتا ہے' دوسری بات حکومت کو یہ ذہن میں رکھنا چاہئے کہ یو ٹیلیٹی سٹورز کی تعداد محدود ہے۔ ہر صارف یو ٹیلیٹی سٹورز سے اشیائے صرف نہیں خرید سکتا اس وقت صرف گھی کی خریداری کے لئے صارفین کو یو ٹیلیٹی سٹورز پر جس طرح دھکے کھانے پڑ رہے ہیں' حکومت کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہئے اور محض فیصلوں اور وعدوں پر عوام کو ٹرخانے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔ یہ صرف اقتصادی رابطہ کمیٹی کا فیصلہ ہے اس پر کہاں تک عمل درآمد ہوتا ہے اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا اصل مسئلہ کھلی مارکیٹ میں اشیائے صرف کی قیمتوں میں کمی اور رسد و طلب کے توازن کو برقرار رکھنے کا ہے۔ ذخیرہ

اندوزی اور بلیک مارکیٹنگ پر قابو پانے کے لئے ناجائز منافع خوروں کو قانون کی گرفت میں لا کر انہیں عبرت دینے کا ہے۔ اس کے بغیر تمام اقدامات صارفین کو لولی پاپ دینے کے مترادف ہیں۔ آج تک کوئی بھی حکومت رمضان المبارک میں تاجروں' دکانداروں کی لوٹ مار کو روک نہیں سکی جس کی بڑی وجہ احتساب کا فقدان ہے' لہٰذا حکومت کو اس طرف بھی توجہ دینی چاہئے تاکہ اس کے کئے گئے فیصلوں کے مثبت نتائج سامنے آسکیں"۔

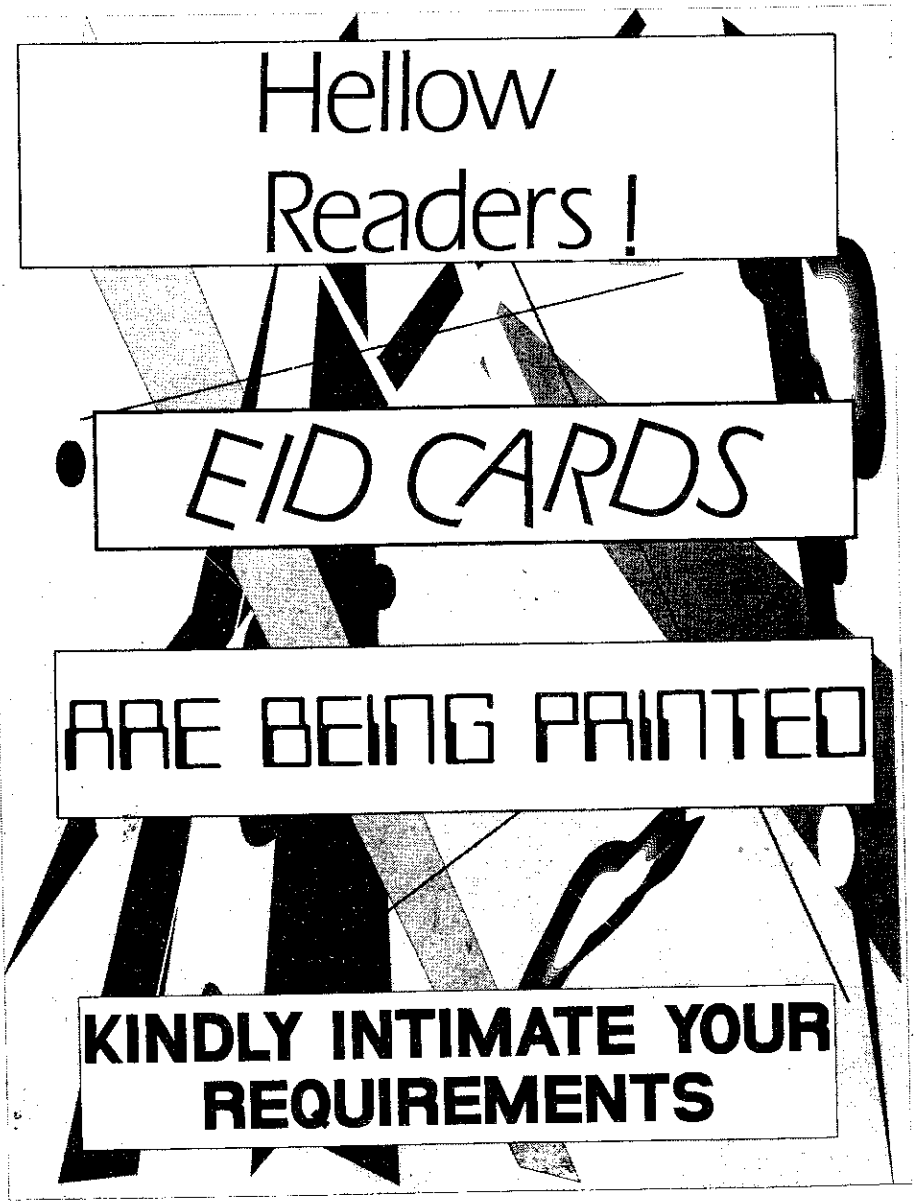

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ !

(بشیر احمد عابد- کویت)

فیض احمد فیض لکھتے ہیں:

"ہم لوگ جو ادیب' قلمکار' یا فنکار کہلاتے ہیں- ہم لوگ جن کے پاس نہ طبل و علم ہے' نہ ملک و مال- جو صرف محبت کرنا اور اپنا دل جلانا جانتے ہیں ! اور ہم جنہیں یہ دعویٰ ہے کہ:

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے !

ہم اپنے اپنے دیس میں بستے ہیں' اور اپنی اپنی قوم کا بھلا چاہتے ہیں- لیکن ساتھ ہی ساتھ دنیا والوں کی نظر میں ہماری ایک عالمگیر برادری بھی ہے- جس کا دل ہر دکھی کے ساتھ دکھتا ہے اور ہر سکھی کے ساتھ خرسند ہوتا ہے- یہ دکھ سکھ ہمارے اپنے ضمیر اور اپنے دل و دماغ کی تخلیق ہوتا ہے- جسے نہ مختلف حکومتوں کی سیاسی مصلحتوں سے واسطہ ہے' نہ سیاسی جماعتوں کے مخصوص تقاضوں سے- پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اگر ساتھ والے گھر میں کوئی ماں' کوئی باپ' کوئی بہن' کوئی بیٹی دکھ درد سے کراہ رہی ہو اور ہم اس کی طرف سے اپنا دل پتھر کر لیں"-

فیض صاحب نے تو یہ بات کسی اور پس منظر میں کہی تھی لیکن یہ اس قدر مبنی برحقیقت ہے کہ اس کا اطلاق ان تمام حالات و واقعات پر ہو سکتا ہے، جو مخلوق خدا کو انتہائی بے بس اور مجبور بنا دیں اور وہ تڑپنے' سسکنے کے علاوہ کچھ نہ کر سکے- یہ حقیقت ہے کہ خلق خدا کو کرب و اذیت میں مبتلا دیکھ کر کوئی بھی درد مند دل رکھنے والا انسان خاموش نہیں رہ سکتا- ہمارے ایمان کا تقاضا ہے کہ باطل قوتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے اور مجبور و مقہور انسانوں کو ان کے پنجۂ استبداد سے چھڑایا جائے-

اس وقت پاکستان کی نوے فیصد سے زائد آبادی گذارے کی حد سے نیچے زندگی بسر کر رہی ہے- محنت مشقت کر کر کے ان کی ہڈیاں چٹخ جاتی ہیں لیکن معاوضہ اتنا کم ملتا ہے کہ عسرت اور تنگدستی سے نجات نہیں ملتی- آمدنی اور اخراجات میں عدم توازن اسقدر شدید ہے کہ اچھے اچھے ذہین اور قابل افراد بھی اپنا بجٹ

متوازن نہیں رکھ سکتے۔ اکثر اوقات جسم و جان کے رشتے کو برقرار رکھنا دشوار سے دشوار تر ہو جاتا ہے اور معاشی ابتری کی وجہ سے جو سماجی برائیاں پیدا ہوئی ہیں ان کا ستم بھی انہی پر ٹوٹتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو مول گاجر کی طرح کاٹ رہے ہیں اور جان' مال' اور عزت کا تحفظ خواب و خیال بن چکا ہے۔ اس وقت سارا معاشرتی نظم و نسق درہم برہم ہے۔ ارباب حل و عقد نے فرض شناسی اور اصول پرستی کی جگہ مفاد پرستی اپنا رکھی ہے اور لوگوں کو اپنے جائز حقوق حاصل کرنے کیلئے بھی در در کی ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں۔ کوئی کسی کا پرسان حال نہیں' الا یہ کہ اس سے مفاد وابستہ ہو۔ نفسا نفسی کا یہ عالم ہے کہ لوگ عام معاشرتی روابط کا پاس بھی نہیں رکھتے۔

عوام اور

ایسے کرب انگیز اور المناک حالات سے عوام کو نکالنا حکمرانوں کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں حکمرانوں کے معیار زیست میں اتنا وسیع بعد پایا جاتا ہے کہ حکمران عوام کے مسائل کا صحیح ادراک ہی نہیں کر سکتے۔ انہیں نہ تو مہنگائی ستاتی ہے اور نہ علاج معالجے کی فکر ہوتی ہے۔ انہیں نہ شہری سہولتوں کے فقدان کے مسائل درپیش ہوتے ہیں اور نہ سرکاری دفاتر میں ان کے کام سرخ فیتے کی نظر ہوتے ہیں۔ ان حکمرانوں کو جب عوام کے مسائل سے آگاہ کیا جاتا ہے تو ان کی کیفیت ملکہ فرانس جیسی ہوتی ہے۔ جس نے روٹی کے مسئلے کا حل ڈبل روٹی تجویز کیا تھا۔

کون نہیں جانتا کہ معاشی بدحالی اور معاشرتی بدامنی کی اصل وجہ سرمایہ دارانہ نظام ہے۔ اس وقت عوام کو جو بھی مشکلات و مسائل درپیش ہیں وہ سب اسی نظام کے پیدا کردہ ہیں۔ اس نظام کی عمارت نفع و نقصان کی بنیاد پر اٹھتی ہے اور طلب و رسد کے اصول اسے مستحکم بناتے ہیں۔ اس فلاسفی کے مطابق معاشرہ واضح طور پر امیر و غریب میں تقسیم ہو جاتا ہے اور ان دونوں طبقات میں بقائے زیست کی کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ اس کشمکش میں کامیابی کا دارومدار طلب و رسد کے اصول پر ہوتا ہے۔ اور چونکہ امیر کو طلب و رسد پر مکمل کنٹرول حاصل ہوتا ہے لہٰذا وہ عوام کی اکثریت کو یرغمال بنائے رکھتا ہے۔ اور حسب منشاء ان کی جیبوں پر ہاتھ صاف کرتا رہتا ہے۔ ایک سرمایہ دار آجر کی شکل میں سامنے آتا ہے اور مہینہ بھر مزدور سے کام لیتا ہے۔ مزدور کے کام سے جتنی آمدنی ہوتی ہے اس میں سے چند سکے بطور تنخواہ ادا کر کے باقی سارا مال سرمایہ دار خود اٹھا لیتا ہے۔ یہ چند سکے جیب میں ڈالکر مزدور جب گھر کو لوٹتا ہے تو سامنے ایک دوسرا سرمایہ دار مالک مکان کے روپ میں کھڑا ہوتا ہے۔ اسے فارغ کر کے جب بچوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو ان آنکھوں میں ایک تیسرا سرمایہ دار کھڑا دکھائی دیتا جسے سکول کی فیس چاہئے ہوتی ہے۔ اسے نمٹانے کے بعد وہ شائد ہی اس قابل ہوتا ہو کہ اپنا مہینہ بھر کا خرچ پورا کر سکے۔ عوام کی اکثریت کو اس صورت حال کا سامنا ہے اور ان کی ساری عمر سرمایہ داروں کی خدمت گذاری میں گذر جاتی ہے۔ یہ صورت حال سرمایہ دارانہ نظام کا خاصہ ہے

اور اس کا واحد حل یہ ہے کہ اسے جڑ سے اکھاڑ پھینک دیا جائے۔ اس نظام کے اندر رہ کر اصلاح احوال کی کوئی کوشش بھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس کے مثال ایسی ہے جیسے کوئی اندھیرے میں راستہ تلاش کرے۔ لیکن چونکہ یہ نظام صدیوں سے مستحکم چلا آرہا ہے لہٰذا اس کی بساط کو لپیٹنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام میں صرف یہی ایک خرابی نہیں ہے کہ یہ اختلافِ صلاحیتِ محنت کشوں کا استحصال کرتا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ بھیانک اور خطرناک بات یہ ہے کہ اس میں دولت کے ارتکاز اور اکتناز پر کوئی پابندی عائد نہیں۔ اس نظام میں ہر کوئی بے حساب دولت اکٹھی کر سکتا ہے اور بے حد و حساب جائدادیں کھڑی کر سکتا ہے۔ اس بے لگام آزادی کے جو برے نتائج سامنے آتے ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔ جس میں جتنی ہمت ہوتی ہے وہ اتنا ہی آگے بڑھ جاتا ہے۔ اسمگلنگ' بلیک مارکیٹنگ' رشوت' غبن' چوری' ڈاکہ غرضیکہ ہر وہ کام جن کا شریف النفس لوگ سوچ بھی نہیں سکتے' سرمایہ پرست بگل بجا کر سرانجام دیتا ہے۔ ان کے اخلاق کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ مجبور اور بے سہارا انسان ان کے دروازوں پر کتوں سے بدتر زندگی بسر کرتے ہیں لیکن مجال ہے جو ان کے دل میں ذرہ بھر احساسِ ندامت پیدا ہوتا ہو۔

دولت سمیٹنے کی کھلم کھلا آزادی انسان کے نفس میں حرص و آز کے جہنم بھڑکا دیتی ہے اور انسان ایک ایسی دوڑ میں شریک ہو جاتا ہے۔ جس کی کوئی انتہا نہیں ہوتی' حالانکہ اس کائنات میں کوئی شے بھی ایسا طرزِ عمل اختیار نہیں کرتی۔ سورج' چاند' ستارے' نباتات' حیوانات' جمادات سب اپنی اپنی جگہ فیض رسانی اور نفع بخشی میں مصروف ہیں۔ سورج کی کرنوں پہ غور کیجئے کس طرح فضائے بسیط میں پھیلی ہر شے کو حرارت بہم پہنچا رہی ہیں۔ زمین میں دانہ ڈالیں تو سوگنا زیادہ لوٹا دیتی ہے۔ گائے کو تھوڑا سا چارہ ڈالدیں تو بالٹی بھر کے دودھ دیتی ہے۔ فصلوں' پھلوں' سبزیوں پہ غور کیجئے۔ سب اپنی اپنی محاصیل کو مفاد عامہ کے لئے کھلا چھوڑ دیتی ہیں۔ اگر اشیائے کائنات سب کچھ اپنے لئے ہی سمیٹ کر رکھ لیں تو کائنات کی نشوونما یک لخت رک جائے اور چار دانگِ عالم میں فساد برپا ہو جائے۔

آج معاشرے میں جو روح فرسا اونچ نیچ پائی جاتی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف کیفیت یہ ہے کہ خلق خدا کی اکثریت بھوک' افلاس اور جہالت کا شکار ہو کر حیوانوں سے بدتر زندگی بسر کر رہی ہے اور دوسری طرف ان کے پہلو بہ پہلو مٹھی بھر سرمایہ دار عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کے پاس وسیع و عریض کوٹھیاں ہیں' لمبی لمبی گاڑیاں ہیں' زرق برق پوشاکیں ہیں' ہیرے جواہرات اور دولت و ثروت کی ریل پیل ہے مگر کسی کا دل خاک میں لت پت مزدور کو دیکھ کر نہیں پسیجتا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جن راہوں پر چل کر انہوں نے یہ خوشحالی حاصل کی ہے ان کے مطابق اس روش کو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ حالانکہ ان کی یہ روش آئینِ فطرت کے بھی خلاف ہے۔ کائنات میں کسی شے کا بھی وجود مقصود بالذات نہیں

ہے۔ تمام اشیائے کائنات باہمی طور پر مربوط اور ایک دوسری کی تکمیل کا باعث بنی ہوئی ہیں۔ اگر ان میں یہ ربط و ضبط قائم نہ رہے تو ان کا حشر بھی وہی ہو جو آج ہم انسانی معاشرے میں دیکھ رہے ہیں۔

اس وقت نوع انسانی کی اکثریت کو جس تکلیف دہ اور ناگوار صورت حال کا سامنا ہے' وہ اسی غیر فطری نظامِ معیشت کی پیدا کردہ ہے۔ دولت جسے معاشرے کی رگِ حیات میں خون کی طرح محو گردش ہونا چاہئے' اس نظام میں کوئی روک ٹوک نہ ہونے کی بنا پر چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جاتی ہے۔

آخری بات یہ کہ اس نظام میں لوگوں کے لئے دولت کا حصول ہی زندگی کا مقصد بن جاتا ہے۔ پوری قوم چند سرمایہ داروں کے نرغے میں گھر جاتی ہے اور ہر وہ کام جو سرمایہ دار کے راحت و سکون کا باعث ہو' اسے ملکی ترقی اور خوشحالی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے معاشی نظام کی ترجیحات میں موٹر ویز' ہوائی اڈے' پارک' سٹیڈیم' آرٹ سنٹرز وغیرہ کی تعمیر سرِفہرست ہوتی ہے۔ ان پر تو قومی دولت پانی کی طرح بہائی جاتی ہے لیکن غریب کی روٹی کا کوئی بندوبست نہیں کیا جاتا۔

اللہ تعالیٰ نے اس غیر فطری' ظالمانہ اور استحصالی نظام پر لعنت بھیجی ہے۔ اور نبیؐ سے کہا ہے کہ: **لا یغر نک تقلب الذین کفروا فی البلاد** ۔ خبردار! سرمایہ داروں کی چہل پہل' بستیوں میں ان کی گہما گہمی تمہاری نگاہ کو فریب نہ دیدے۔

متاع قلیل ز ثم ماواھم جھنم ط وبئس المھاد ۔ یہ خوشگواریاں بڑی بے حقیقت ہیں اور ان سے محض تھوڑی سی مدت کیلئے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد تباہی اور بربادی کا جہنم ہو گا اور یہ ہوں گے۔ اور وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔ 3:196-197

اس نظام کے اندر لوگ۔ رزق کے ان سرچشموں پر' جنہیں بہتے پانی کی طرح ہر ایک کی ضروریات کے لئے کھلا رہنا چاہئے' بند لگا کر' اپنا قبضہ جما لیتے ہیں اور اس طرح ضرورتمندوں کو سامان زیست سے محروم کر دیتے ہیں۔ پھر ایسے قوانین و ضوابط بناتے ہیں جس سے معاشرہ میں ان کی یہ روش معیوب ہی نہیں سمجھی جاتی۔ بخل عام ہو جاتا ہے اور یوں ہر شخص ان چیزوں کو اپنے لئے چھپا چھپا کر جمع کرتا چلا جاتا ہے۔ جو اسے خدا کے فضل و کرم سے عطا ہوتی ہیں۔ اس روش کے تباہ کن عواقب سے آگاہ کرتے ہوئے کہا:

ولا یحسبن الذین یبخلون بما اتاھم اللہ من فضلہٖ خیرا لھم

"سو جو لوگ' اس سامانِ معیشت کو' جسے اللہ نے انہیں دے رکھا ہے' ان لوگوں سے روک لیں جنہیں اس کی ضرورت ہے۔ تو وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ یہ روش ان کے حق میں بہت اچھی ہے"۔

بل ھو شر لھم ط نہیں! یہ روش ان کے لئے بڑی خرابی کا موجب ہے۔ (3:179)

نظامِ سرمایہ داری کی تقویت کا باعث ربٰو کا نظام ہوتا ہے۔ یہ اسی کے بل بوتے پر آگے بڑھتا ہے۔

ربوٰ سے یہ ذہنیت عام ہو جاتی ہے کہ جہاں تک ہو سکے' سامانِ زیست کو لوگوں سے چھپا کر رکھا جائے تاکہ وہ اس کے محتاج ہوں' اور قرض لینے پر مجبور' اور قرض دینے والا ان کی محنت کی کمائی پر عیش اڑائے۔ اس سے انسان کی قوت عمل مفلوج ہو جاتی ہے اور وہ سفر زندگی میں آگے بڑھنے کے قابل نہیں رہتا۔ لہٰذا نظامِ سرمایہ داری کی حامل قوم بالآخر تباہ و برباد ہو کر رہتی ہے۔ جماعت مومنین سے کہا' اگر یہ لوگ (سرمایہ پرست) اپنی روش سے باز نہ آئیں

فاذ نوابحرب من اللہ ورسولہ ط تو تم ان کے خلاف اعلان جنگ کر دو۔ ! (2:279)

اس نظام نے انسانوں کی اکثریت کو غلام بنا دیا اور ان کی صلاحیتیں دب کر رہ گئی ہیں۔ یہ وہ نظام ہے کہ جس نے وحدت انسان کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ انسانوں کو قناعت سکھانے کی بجائے حرص و آز کے جہنم میں دھکیل دیا ہے۔

آج ہر انسان کلب المسعور (Mad Dog) کی طرح عذاب السعیر میں مبتلا ہے۔ اگر یہ نظام لوگوں کے معاشی مفاد میں تزاحم و تصادم پیدا نہ کرتا تو آج پوری دنیا کے انسان ایک برادری اور ایک قوم ہوتے۔ انسان کی تاریخ کے ابتدائی ادوار میں بعینہٖ یہی کیفیت تھی۔ **کان الناس امتہ واحدۃ** انسان کی ضروریات محدود اور اشیائے صرف وافر مقدار میں دستیاب تھیں۔ فطری اونچ نیچ کو لوگ اپنی کشادہ نگاہی اور وسیع القلبی سے مٹا دیتے تھے۔ اس لئے ان کے مابین باہمی مفادات میں ٹکراؤ نہیں ہوتا تھا اور سب ایک برادری کی شکل میں رہتے تھے۔ بعد ازاں جب تمدنی زندگی کا ارتقاء شروع ہوا تو بوجوہ ان میں اختلافات پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ ان اختلافات کی نوعیت ایسی تھی کہ ان کا مٹانا تنہا عقل انسانی کی بس کی بات نہ تھی۔ کیونکہ ہر فرد اور ہر گروہ کی عقل اس کے ذاتی مفاد کا تحفظ چاہتی ہے۔ دوسروں کا مفاد اس کے سامنے ہوتا ہی نہیں ہے۔ اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیاءؑ کرام کو اپنی وحی دے کر بھیجا تاکہ وہ اس کے مطابق لوگوں کے اختلافی امور کا فیصلہ کریں۔ انبیاءؑ اکرام لوگوں کو اختلافی زندگی کے عواقب سے آگاہ کرتے اور ان میں وحدت پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ وحی کی راہنمائی تمام انسانوں کو ایک برادری میں منسلک کر دینا چاہتی ہے' لیکن چونکہ اس سے انفرادی مفاد چاہنے والوں کے مقاصد پر زد پڑتی ہے۔ اس لئے وہ اس کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔

جب تک انبیاءؑ کرام کی بعثت کا سلسلہ جاری تھا۔ سرمایہ پرستوں کی مخالفت بالکل واضح ہوتی تھی۔ اور معاشرے میں ان کو پہچاننا مشکل نہیں ہوتا تھا۔ ہر نیا آنے والا نبیؑ گذشتہ نبیؑ کی امت میں سے چن چن کر بتا دیتا کہ کون راہ حق سے بھٹک گیا ہے اور کون جادۂ مستقیم پر گامزن ہے؟ سرمایہ پرست اور حق پرست کے مابین فرق صاف واضح ہوتا تھا۔ نبیؐ اکرمؐ کی بعثت کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ آپ کی وفات کے بعد امت

نے دوبارہ سرمایہ پرستی کا مسلک اختیار کر لیا اور ان میں ایسے ایسے سرمایہ دار پیدا ہو گئے جنہیں دیکھ کر غیر مسلم بھی شرماتے ہیں۔ لیکن آج صورت حال یہ ہے کہ سرمایہ پرستی مطابقِ اسلام قرار پا چکی ہے۔ ان کے خلاف جو کوئی بھی آواز اٹھاتا ہے۔ کمیونسٹ کہلاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ افلاطون کے پاس ستر غلام تھے اور وہ غلاموں کے حق میں ستر دلیلیں دیا کرتا تھا۔ یہی کیفیت ایک مسلمان کی ہے۔ جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہو گی لیکن سرمایہ پرستی کے حق میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیگا۔ عقل حیران ہے کہ انہیں کیا ہو گیا ہے؟ یوں تو ہر مسلمان کا دعویٰ ہے کہ قرآنِ کریم کے ایک ایک لفظ پر اس کا اٹل ایمان ہے۔ سنتِ رسولؐ اللہ کی ایک ایک شق پر عمل کرنا اپنے لئے موجبِ رحمت سمجھتا ہے لیکن عمل اس کے یکسر خلاف ہے۔

اس امت کا بچہ بچہ شاہد ہے کہ رسولؐ اللہ سرمایہ پرست نہیں تھے۔ ان کی زندگی سادگی اور قناعت کا بہترین نمونہ تھی دوسری طرف قرآنِ کریم کو لیجئے اس کا ایک ایک لفظ سرمایہ پرستی کے خلاف طبلِ جنگ ہے۔ لیکن جب سرمایہ داری نظام کے خلاف کوئی مہم اٹھتی ہے تو کوئی ساتھ نہیں دیتا۔ سب چپ سادھ لیتے ہیں۔ نہیں ! بلکہ اس کے حق میں اتنے اعتماد اور وثوق کے ساتھ بحث کی جاتی ہے جیسے قرآنِ کریم (معاذ اللہ) آدم سمتھ (Adam Smith) کی کتاب ویلتھ آف نیشن (Wealth of Nation) ہو اور رسولؐ اللہ خود (نعوذ باللہ) کٹر قسم کے سرمایہ دار ہوں !

مومن کی زندگی تو یہ ہوتی ہے کہ اس نے اپنی جان' اپنا مال' اپنا سب کچھ اللہ کے ہاتھ بیچ دیا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ انہیں اس کے عوض جنت کی زندگی کی ضمانت دیتا۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ! (التوبہ_ 111)_ ان کے نزدیک مال و دولت کی اہمیت فقط اتنی ہوتی ہے جتنی کہ ایک مسافر کے لئے سامانِ سفر کی ہوتی ہے۔ نہ کم' نہ زیادہ۔ بس اتنا کہ جس سے سفر بآسانی کٹ جائے۔ دولت کے انبار لگانا اور سونے چاندی کے پہاڑ کھڑے کرنا ان کے آئینِ حیات سے خارج ہوتا ہے۔ ان چیزوں کو وہ اپنے لئے جہنم کے انگارے سمجھتے ہیں۔ ان حالات سے خائف رہتے ہیں جو ارتکازِ زر کا لازمی نتیجہ ہوتے ہیں اور جن کے باعث معاشرہ جہنم بن جاتا ہے۔ ان حالات میں کسی کی جان' مال' عزت محفوظ نہیں رہتی خواہ وہ سرمایہ پرستی کے حق میں ہو یا خلاف !

مومن کی زندگی کا نصب العین رضائے خداوندی کا حصول اور جنت اس کی منزل ہوتی ہے۔ یہ چیز مال و دولت جمع کرنے سے نہیں بلکہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ ایسے لوگ تو خود جنت نظیر ہوتے ہیں۔ ارشاد ہے۔

ومثل الذین ینفقون اموالھم ابتغاء مرضات اللہ و تثبیتا من انفسھم کمثل جنۃ بربوۃ۔

جو لوگ اپنی محنت کی کمائی کو کھلا رکھتے ہیں تاکہ اسے قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کیا جائے اور اس

سے نوعِ انسان کی پرورش اور ان کی اپنی ذات کا استحکام و ثبات ہو جائے ان کی مثال ایک عالی مقام جنت کی ہے"! (2:265)

ایک مومن جب لا الہ الا اللہ کہتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس کا رشتہ انسان کے خود ساختہ تمام نظامہائے زندگی سے کٹ جاتا ہے۔ وہ اپنے ذاتی مفاد کی کشش سے نکل جاتا ہے اور اپنی زندگی کا ہر سانس خلقِ خدا کی خدمت کے لئے وقف کر دیتا ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب اس کے پاس کہیں سے مال آتا ہے تو وہ اسے اپنے ہاتھ میں اتنی دیر بھی نہیں رکھتا جتنی دیر ایک انسان اپنے ہاتھ میں آگ کے دہکتے ہوئے انگارے کو رکھ سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کوئی مسلمان سرمایہ پرست نہیں ہو سکتا اور نہ ہی کوئی سرمایہ پرست مسلمان کہلا سکتا ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ اڑھائی فیصد زکوٰۃ دیکر مال پاک و صاف ہو جاتا ہے اور پھر کوئی جتنا چاہے مال رکھ لے کوئی گناہ نہیں! یہ سرمایہ پرستوں کی پھیلائی ڈس انفارمیشن (Dis Information) ہے۔ یہ چیز نہ تو خدا کا حکم ہے اور نہ ہی رسولؐ اللہ کی سنت ہے۔ زکوٰۃ کی جو اہمیت بیان کی جاتی ہے اور جو اس کا موجودہ تصور ہے اگر وہ صحیح ہوتا تو جس طرح رسولؐ اللہ نے **اقیمواالصلوۃ** کے حکم پر عمل کیا ہے اس طرح **اتوا الزکواۃ** کے حکم پر بھی عمل کرتے لیکن واقعہ یہ ہے کہ آپؐ نے زندگی بھر ایک **ٹکہ** بھی زکوٰۃ میں نہیں دیا۔ اس سے صاف واضح ہے کہ زکوٰۃ کا موجودہ تصور سراسر مفاد پرست طبقے کی تراشیدہ اختراع ہے۔ اس سے دین کا دور کا واسطہ بھی نہیں۔ قرآن کریم میں صدقہ و خیرات سے متعلق انفرادی نوعیت کے جتنے احکام بھی ہیں ان کا تعلق عبوری دور سے ہے' جب تک کہ اسلامی حکومت قائم نہیں ہو جاتی۔ اس کے قیام کے بعد تمام مالی امور ایک نظام کے تابع آجاتے ہیں۔ اس نظام میں کوئی فرد زائد از ضرورت اشیاء اپنی تحویل میں نہیں رکھتا۔ وہ زائد از ضرورت اشیاء اور مال حکومت کے سپرد کر دیتا ہے تاکہ وہ اسے مفادِ عامہ کیلئے بہتر طور پر صرف کر سکے۔ دوسری طرف حکمرانوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔ کہ وہ اس قومی امانت میں ایک پائی کی خیانت بھی نہیں کرتے اور اسے ٹھیک پیمانوں سے خرچ کرتے ہیں۔

یہ تھا وہ نظام' حیات بخش اور انسانیت دوست' کہ جس نے چالیس سال کے مختصر عرصہ میں سرمایہ پرستی کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔ اور تمام سرمایہ داروں کو نیست و نابود کر دیا۔ آج نوعِ انسانی پھر سے سرمایہ پرستی کے شکنجے میں جکڑی کراہ رہی ہے۔ مٹھی بھر سرمایہ داروں نے اپنے عارضی آرام و سکون کی خاطر پورے کرۂ ارض کو جہنم بنا رکھا ہے' اور اس مذموم فعل کے ارتکاب میں مسلمان سرمایہ دار سرفہرست ہیں۔ ہر خیانت کے پیچھے سرمایہ دار کا ہاتھ ہے۔ اسلحہ کی لعنت ہے تو سرمایہ دار کی وجہ سے۔ منشیات کی لعنت ہے تو سرمایہ دار کی وجہ سے۔ افراطِ زر' فحاشی' زنا کاری' جرائم کی پشت پناہی' سیاسی افراتفری سب انہی کی کارستانی ہے۔

خدا انہیں غارت کرے یہ نوع انسان کو کس طرف لے جا رہے ہیں ! ہم تو بس انتظار میں ہیں:

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر روز مکافات

کراچی صدر اور حیدر آباد (قاسم آباد) سندھ میں

سلسلہ وار درس قرآن کریم کا اہتمام (بذریعہ ویڈیو کیسٹ) مندرجہ ذیل مقامات پر کیا گیا ہے۔

شہر و مقام		دن	وقت
کراچی صدر	فاروق ہوٹل ہال۔ زیب النساء سٹریٹ بالمقابل فٹ رائٹ شوز شاپ	جمعۃ المبارک	10 بجے صبح
حیدر آباد	12-B حیدر آباد ٹاؤن فیز 2 بالمقابل نسیم نگر قاسم آباد	جمعۃ المبارک بعد نماز عصر	

دعوت عام ہے تشریف لائیں

قرآنی لٹریچر۔ جملہ مطبوعات طلوع اسلام ٹرسٹ، مجلّہ طلوع اسلام کے تازہ شمارے درس کے دوران 35% رعایت کے ساتھ حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

رابطہ : ایاز حسین انصاری نمائندہ بزم طلوع اسلام کراچی صدر، بزم طلوع اسلام قاسم آباد حیدر آباد (سندھ)
ٹیلی فون : کراچی 4571919 حیدر آباد 654906

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

روزوں کا مقصد

(پرویز صاحب کا ایک درسِ قرآن)

قرآن کریم میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ (۲/۱۸۳) "اے جماعتِ مومنین! تم پر صیام فرض قرار دیئے گئے ہیں"۔ یہ "کتاب" یعنی حکم ہے۔ اس کی غایات کے متعلق کہا: لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ (۲/۱۸۳) لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ (۲/۱۸۵) اور وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمۡ۔ (۲/۱۸۵)

تَتَّقُوۡنَ سے مراد یہ ہے کہ تم میں قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے لئے پختگی پیدا ہو جائے اور تم غلط راہوں پر چلنے کے نقصانات سے محفوظ ہو جاؤ۔ تشکرون، سے مقصود یہ ہے کہ تمہاری محنتیں بھرپور نتائج پیدا کریں۔ میں ان دو غایات کے متعلق سردست تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ قرآن کریم نے جو غایت الغایات بیان کی ہے اس پر مرکوز ہوں گا۔ اور وہ غایۃ الغایات یہ ہے کہ تم خدا کے بتائے ہوئے پروگرام پر عمل کرنے سے اس قابل ہو جاؤ گے کہ دنیا میں خدا کی کبریائی قائم کر سکو۔ یہ ہے روزوں کے متعلق حکمِ خداوندی کا مقصود و منتہیٰ۔ یعنی خدا کی کبریائی قائم کرنے کے قابل ہو جانا:

لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمۡ

سب سے پہلے لفظ "کبریائی" کو لیجئے۔ اس کے معنی حکومت اور اقتدار کے ہیں۔ سورۂ یونس میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ اور ان کے بھائی حضرت ہارونؑ فرعون کے پاس گئے اور اس تک خدا کا پیغام پہنچایا تو اہلِ فرعون نے کہا کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو ہم اس کی غرض و غایت کو خوب پہنچانتے ہیں۔ یعنی یہ کہ تَکُوۡنَ لَکُمَا الۡکِبۡرِیَآءُ فِی الۡاَرۡضِ (۱۰/۷۸) "تمہارا مقصد یہ ہے کہ اس ملک میں حکومت تمہاری قائم ہو جائے۔ اقتدار تمہارے ہاتھ میں آجائے"۔ اس سے لفظ "کبریائی" کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

---

(۰)

جہاں تک خارجی کائنات کا تعلق ہے اس میں خدا کا اقتدار اور اس کی حکمرانی براہِ راست قائم ہے۔ یہ کارگہِ کائنات اسی کے قوانین کے مطابق سرگرمِ عمل ہے اور اس میں کسی شے کو مجالِ انحراف نہیں

۔ ـــے سرکشی نہیں: وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۳۷/۴۵)
"کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں کبریائی خدا کی ہے۔ وہ زبردست غلبہ کا مالک ہے۔ لیکن اس کا غلبہ مستبد حکمرانوں کا غلبہ نہیں۔ وہ سراسر حکمت پر مبنی ہے۔" دوسری جگہ ہے: وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَاءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ۔ (۸۴/۴۳) "وہی آسمانوں میں بھی صاحب اقتدار ہے اور وہی ارض پر بھی صاحب اقتدار۔" (الٰہ کے معنی صاحب اقتدار کے ہیں)۔

خارجی کائنات میں تو خدا کا اقتدار ازخود قائم ہے۔ لیکن اس کی مشیت کا پروگرام یہ ہے کہ انسانوں کی دنیا میں اس کی کبریائی ازخود نہیں بلکہ انسانوں کے ہاتھوں قائم ہو۔ اسی مقصد کے لئے رسول بھیجے جاتے تھے اور رسول کے بعد اس کی ذمہ داری اس کی اُمت پر عائد ہوتی تھی۔ چنانچہ جب نبی اکرم ؐ کو منصب نبوت پر سرفراز فرمایا گیا تو آپ کو حکم دیا گیا کہ يَآاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ۔ "اے وہ کہ جس کی آمد سے خزاں دیدہ گلشن کائنات بہار نو کا مظہر بن جائے گا۔ (المدثر کے یہی معنی ہیں)۔ قُمْ فَاَنْذِرْ۔ "اُٹھ اور نوع انسان کو ان کے اپنے وضع کردہ نظام ہائے حیات کی تباہ کاریوں سے آگاہ کردے"؛ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (۱-۲/۷۴)۔ "اور ان نظاموں کی جگہ اس نظام کو قائم کر جس میں کبریائی صرف خدا کے لئے ہو"۔ ـــــــ یہ تھا منصب رسالت۔

دوسرے مقام پر اسی حقیقت کو جن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ان کی تفصیل بڑی وسعت چاہتی ہے۔ لیکن میں ان میں سے صرف دو ٹکڑوں کو نمایاں طور پر سامنے لاؤں گا۔ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ۔ "حکومت صرف اسی کے لئے مختص ہے۔ اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا"۔ اور اس سے آگے ہے؛ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا۔ (۱۱۱/۱۷) "لہٰذا تم اس کی کبریائی قائم کرو"۔ اسی اعتبار سے خدا نے اپنے آپ کو ایک جگہ اَلْمُتَكَبِّرُ (۲۳/۵۹) کہا ہے۔ کہیں اَلْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ (۹/۱۳) اور کہیں اَلْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ۔ (۶۲/۲۲) ہماری دنیا میں وہ اَلْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ۔ کیسے قرار پاتا ہے اس کی وضاحت اس نے یہ کہہ کر کردی کہ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ (۱۲/۴۰) تمہاری دنیا میں حکم صرف اس خدا کا چلنا چاہیئے جو ہر قسم کے غلبہ اور کبریائی کا مالک ہے۔

اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا نہ تو ہمارے سامنے آتا ہے۔ نہ وہ تخت حکومت پر بیٹھتا ہے۔ نہ ہم اس کی آواز سنتے ہیں۔ تو ہمارے معاشرے میں اس کی حکومت کیسے قائم ہوگی؟ اس کے لئے اس نے خود ہی بتا دیا کہ ـــــــ اس نے ہماری طرف اپنا ضابطہ احکام بھیج دیا ہے۔ جو حکومت اس ضابطہ کے مطابق قائم ہوگی اُسے خدا کی حکومت سے تعبیر کیا جائے گا۔ چنانچہ اس نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۴۴/۵)

جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے ان ہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

ـــــــ (۰) ـــــــ

لیکن خدا کی یہ کبریائی یونہی بیٹھے بٹھائے، وعظ و نصیحت یا تقاریر و خطابات سے قائم نہیں ہو جاتی

جب اس کا مقصد دنیا کے ہر نظام کو اُلٹ کر اُس کی جگہ نظامِ خداوندی کو متمکن کرنا ہے تو ظاہر ہے کہ دنیا کی ہر قوم اور ہر حکومت کی طرف سے اس کی مخالفت ہوگی اور ہر مفاد پرست گروہ اس کی مزاحمت کرے گا ــــ ان مخالفتوں اور مزاحمتوں کے مقابلے کے لئے میدانِ جنگ تک میں بھی جانا پڑے گا۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں جماعتِ مومنین کی ان جنگوں کی غایت یہ بتائی گئی ہے:۔

وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا۔ (۹/۴۰)

اس سے مقصد یہ ہے کہ ہر غیر خداوندی نظام مغلوب ہو جائے، اور خدا کا نظام جسے غالب ہونے کا حق حاصل ہے، عملاً مسلط ہو جائے۔

اس سے چند ہی آیات پہلے کہا گیا ہے:۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔ (۹/۳۳)

خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ضابطۂ ہدایت اور حق پر مبنی نظام دے کر بھیجا تاکہ یہ نظام انسانوں کے ہر خود ساختہ نظام پر غالب آجائے۔ خواہ یہ تبدیلی ان لوگوں پر کتنی ہی گراں کیوں نہ گزرے جو خالص حکومتِ خداوندی قائم نہیں کرنا چاہتے۔

یہاں صرف اتنا کہا گیا ہے کہ اس نے رسول کو اس مقصد کے لئے بھیجا۔ لیکن دیگر مقامات پر اس کی وضاحت کر دی کہ نظامِ خداوندی کا قیام تنہا رسول کے ہاتھوں سے عمل میں نہیں آئے گا۔ اس کے لئے جماعتِ مومنین کی معاونت و رفاقت بھی ضروری ہوگی۔ یعنی یہ فریضہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ (۴۸/۲۹) کے ہاتھوں سرانجام پائے گا۔

اللہ تعالےٰ نے اَلاعلیٰ اپنے آپ کو کہا تھا۔ لیکن جس جماعتِ مومنین کے ہاتھوں اس کی کبریائی دنیا میں قائم ہوتی ہے۔ اس نے انہیں اَلْاَعْلَوْنَ کہہ کر پکارا ہے۔ چنانچہ اس نے فرمایا: وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۳/۱۳۸) "اگر تم مومن ہو اور مومن رہو گے تو دنیا میں تم ہی سب پر غالب رہو گے"۔ تمہارا قائم کردہ نظام انسانوں کے ہر خود ساختہ نظام پر غالب آجائے گا۔ اس غلبہ و تسلط کے لئے قرآنِ کریم نے اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ کی شرط عائد کر دی ہے۔ "یعنی اگر تم مومن ہوئے تو"۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ ہم مومن ہیں یا نہیں؟ اس کے لئے قرآن نے خود یہ واضح کر دیا کہ جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ مومن نہیں کافر ہیں۔ لہٰذا مومن وہ ہیں جو خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم کرتے ہیں۔ اور اس کی محسوس نشانی یہ ہے کہ وہ دنیا کی ہر قوم پر غالب رہتے ہیں۔ چنانچہ اس نے واضح طور پر کہہ دیا کہ

وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (۴/۱۴۱)

خدا کبھی ایسا نہیں ہونے دے گا کہ غیر خداوندی نظام کی حامل قوم کو جماعتِ مومنین پر غالب آنے دے۔

لہٰذا یہ متعین کرنا بالکل آسان ہو گیا کہ ہم مؤمن ہیں یا نہیں؛

یہاں ایک عظیم نکتہ سامنے آتا ہے۔ خدا مؤمنین سے کہتا ہے کہ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ۔ لیکن مؤمن اس کی عطا کردہ اس سرفرازی کے جذبۂ تشکر کے احساس سے بے ساختہ اپنا سر زمین پر رکھ دیتا ہے اور انتہائی انکساری اور خاکساری کے عالم میں کہتا ہے کہ اَلْاَعْلٰی میں نہیں۔ سُبْحٰنَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی ـــــ اَلْاَعْلٰی کے شایانِ شان صرف تیری ذات ہے۔ یہ تو تیری عاجز نوازیاں ہیں، جو ہمیں اَلْاَعْلَوْنَ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یہ علو مرتبت ہماری ذاتی نہیں، تیری عطا فرمودہ ہے۔ اگر ہمارا سر تیرے سامنے نہیں جھکتا تو یہ ساری کبریائی جو ہمیں حاصل ہوئی ہے فرعون کی تہربانیت ہے، مؤمن کی علوِّشان نہیں۔ اسی بنا پر قرآن کریم نے حق پر مبنی کبریائی اور باطل پر مبنی کبریائی میں فرق کر کے بتا دیا جب کہا:۔

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ۔ (۷/۱۴۶)

جو لوگ الحق کے بغیر زمین میں غلبہ اور کبریائی حاصل کر لیتے ہیں، ہم اپنے قوانین کی رو سے انہیں اس مقام سے ہٹا دیں گے۔ اور ان کی جگہ وہ قوم لے لے گی جس کی کبریائی الحق پر مبنی ہو گی۔

ـــــــــ (۰) ـــــــــ

ان تصریحات سے واضح ہو گیا کہ روزوں کی غرض و غایت اور مقصود و منتہیٰ کیا تھا؛ ان کا مقصد جماعتِ مؤمنین کو اس کے لئے تیار کرنا تھا کہ وہ دنیا میں خدا کی کبریائی متمکّن کر سکیں۔ لِتُکَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هَدٰىكُمْ۔ صدرِ اوّل کی جماعتِ مؤمنین تیرہ برس تک مکّہ کی زندگی گذارنے کے بعد مدینہ میں آئی تاکہ یہاں کی نسبتاً مساعد فضا میں نظامِ خداوندی کی بنیاد رکھ دی جائے، لیکن مخالفین نے انہیں یہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا اور مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ یہ تھا وہ مقام جب پہلی مرتبہ (۲ھ میں) روزے فرض ہوئے، اور ابھی سترہ دن کے روزے ہی رکھے گئے تھے کہ انہیں بدر کے میدان میں اترنا پڑا اور وہاں ان روزہ داروں نے خدا کی کبریائی کی پہلی اینٹ رکھ دی۔ آپ نے غور فرمایا کہ روزوں کی غایت کیا تھی؟ ـــــ لِتُکَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هَدٰىكُمْ۔ خدا کے پروگرام کے مطابق ملک میں اس کی کبریائی قائم کرنا۔ اس زمانے میں مستقل فوج (STANDING ARMY) ہنوز وجود میں نہیں آئی تھی۔ قرآنِ مجید نے تمام مؤمنین کو مجاہدین (فوج کے سپاہی) قرار دیا تھا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ جس طرح آجکل مستقل فوج سے الگ ـــــ (RESERVISTS) ہوتے ہیں۔ وہ اپنا اپنا کاروبار کرتے رہتے ہیں لیکن انہیں سال میں ایک آدھ ماہ کے لئے بلا لیا جاتا ہے تاکہ وہ فوجی ٹریننگ کی تجدید کر لیں اور بوقتِ ضرورت فوج کے ہمدوش میدانِ جنگ میں نبرد آزما ہوں۔ خدا کی کبریائی کا تمکّن مؤمن مجاہدین کا فریضہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ رمضان کا مہینہ انہیں سپاہیانہ زندگی کا خوگر بنانے کے لئے مختص کر دیا گیا تھا۔ حضور نبی اکرمؐ سے جب سوال کیا گیا کہ مؤمن کی زندگی کیا ہے؛ تو فرمایا کہ جب جنگ ہو رہی ہو تو وہ میدانِ جنگ میں ہو۔ اور جب جنگ نہ ہو رہی ہو تو وہ جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو۔

آپ نے دیکھا کہ مؤمن کی زندگی کا مقصود و منتہیٰ دنیا میں خدا کی کبریائی کو متمکّن کرنا ہے اور یہی مقصد روزوں

کا بتایا گیا ہے۔ اس کے لئے رمضان کے مہینے کی تخصیص کیوں کی گئی، اسے خود خدا نے یہ کہہ کر واضح کر دیا کہ

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (2/185) "رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں نزولِ قرآن کی ابتدا ہوئی۔" قرآنِ کریم کو اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسان کے لئے نعمتِ عظمیٰ قرار دیا ہے اور ان سے کہا ہے کہ تم ایسی عظیم متاع کے ملنے پر جشنِ مسرت مناؤ:

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ۔ (10/58)

اے رسول! ان سے کہہ دو کہ تمہیں یہ متاعِ گراں بہا بلا مزد و معاوضہ مل گئی ہے۔ اس کے ملنے پر تم جشن مناؤ۔ تم جو کچھ بھی دنیا میں جمع کرو، یہ اس سے زیادہ گراں قدر ہے۔

لہٰذا، جسے عید الفطر کہا جاتا ہے وہ درحقیقت جشنِ نزولِ قرآن ہے۔ قرآن، خدا کی کبریائی کا ضابطۂ ہدایت ہے اور رمضان کے مہینے کے روزے مجاہدین کو خدا کی کبریائی قائم کرنے اور مستحکم رکھنے کا پروگرام۔ اس پروگرام کے بخیر و خوبی انجام پانے پر جشنِ مسرت بالکل فطری عمل ہے۔

یہ تھا دین میں روزوں کا مقصد۔ یعنی لتکبروا اللہ علیٰ ما ھداکم۔ تاکہ زمین پر خدا کی حکومت قائم کی جائے۔ لیکن جب دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا تو قرآنِ کریم کے یہ الفاظ تو باقی رہ گئے لیکن ان کی غرض و غایت بالکل بدل گئی۔ آپ قرآنِ کریم کا کوئی سا با ترجمہ نسخہ اٹھا کر دیکھیں۔ اس میں ان آیات کا ترجمہ ان الفاظ میں ملے گا۔ "تاکہ تم خدا کی بڑائی بیان کرو۔" یعنی دین میں ان الفاظ کا مفہوم، خدا کی کبریائی قائم کرنا تھا۔ مذہب میں ان کا مطلب خدا کی بڑائی بیان کرنا رہ گیا۔ کبریائی قائم کرنے اور بڑائی بیان کرنے میں جو فرق ہے وہ واضح ہے۔ اس "بڑائی بیان کرنے" کے حکم کی اطاعت کے متعلق کہا گیا کہ نمازِ عید میں جو چھ تکبیریں زائد کہی جاتی ہیں، ان سے اس حکم کی تعمیل ہو جاتی ہے۔ اذان، نماز اور عیدین کی تکبیریں اپنی اپنی جگہ بجا اور درست، لیکن یہ تکبیریں ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ، یا ایک واقعہ کا اعلان تھیں۔ یعنی اس واقعہ کا اعلان کہ یہاں خدا کی کبریائی قائم ہے۔ اس حقیقت کے وقوع پذیر ہوئے بغیر، اس قسم کے اعلانات صرف چند الفاظ کا اعادہ ہیں۔ حقیقت اور اس کی رسمی ادائیگی کا یہی وہ فرق تھا جس کے احساس سے اقبالؒ کے دردمند دل نے با صد آہ و فغاں کہا تھا کہ ؎

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن — مُلّا کی اذاں اور، مجاہد کی اذاں اور!
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک جہاں میں — کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

یہ مجاہد کی اذان تھی جو دن میں متعدد بار چھت اور مینارہ پر کھڑے ہو کر، دنیا میں اعلان کرتی تھی کہ

اَللّٰهُ اَكْبَرُ

کبریائی صرف خدا کے لئے مختص ہے۔ اس میں کوئی اور شریک نہیں ہو سکتا۔ اور اس کے بعد وہ اعلان کرتا تھا کہ

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

ہیں۔ اس حقیقت کی شہادت دیتا ہے کہ خدا کے سوا کوئی صاحب اقتدار نہیں۔ آپ نے کبھی اس پر غور فرمایا کہ اس اعلان میں یہ نہیں کہا گیا کہ میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں یا اعلان کرتا ہوں۔ کہا یہ گیا ہے کہ میں اس حقیقت کی "شہادت دیتا ہوں"۔ شہادت اسی کی قابلِ قبول ہوتی ہے جسے اس بات کا ذاتی طور پر علم ہو۔ جو اس کا عینی شاہد ہو۔ اگر کوئی شخص عدالت میں جا کر یہ کہے کہ مجھے اس واقعہ کا ذاتی طور پر تو علم نہیں۔ میرا خیال یہ ہے۔ یا میں نے ایسا سُنا ہے تو اس کی شہادت کا قابلِ قبول ہونا تو درکنار اسے درخورِ سماعت بھی نہیں سمجھا جاتا۔ لہٰذا، اشھد ان لا الٰہ اسی کا قابلِ قبول ہوگا جو یہ کہے کہ میں اس کا گواہ ہوں کہ یہاں خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ یہاں خدا کے سوا کسی کی حکومت نہیں۔ یہاں حکمرانی صرف خدا کی ہے۔ جو اس حقیقت کا شاہد نہیں اُسے اشھد ان لا الٰہ الا اللہ کہنے کا حق حاصل نہیں۔ یہی وہ شہادت ہے جس کے متعلق خود اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ شَہِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ۔ "خدا اس کی شہادت دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں ہے"۔ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ "اور ملائکہ جو اس کے اس اقتدار کو بروئے کار لانے کے لئے مامور ہیں وہ بھی اس کی شہادت دیتے ہیں"۔ انہیں بھی اس کا حق حاصل ہے کہ وہ بھی اس کی شہادت دیں، کیونکہ وہ اس کے عینی شاہد ہیں۔ اس کے بعد ہے، وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ۔ "ان کے علاوہ وہ لوگ بھی اس کی شہادت دے سکتے ہیں جنہیں اس کا علم بھی حاصل ہے اور پھر وہ ایسا نظام متشکل کئے ہوئے ہیں جس میں خدا کی میزانِ عدل قائم ہے"۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے ذاتی علم اور مشاہدہ کی بناء پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (۳/۱۸) "خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں اور اس کا اقتدار تنہا قوت پر نہیں، بلکہ قوت کے ساتھ حکمت پر مبنی ہے"۔

آپ نے غور فرمایا کہ ——— قرآن کریم کی رُو سے اللہ اکبر کہنے کا حق کسے حاصل ہے؛ رمضان کے روزے جماعتِ مومنین کو اس قابل بنا دینے کے لئے تھے کہ وہ مُلک میں خدا کی کبریائی قائم کریں اور پھر ساری دنیا کے سامنے اس کی شہادت دے سکیں۔

یہ ہے عزیزانِ من، میری قرآنی بصیرت کے مطابق صیام کی غرض و غایت اور رمضان کا مقصود و منتہیٰ۔

والسلام

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

——— (۰) ———

(یہ ہوتا ہے انداز محترم پرویز صاحب کے درسِ قرآن کا۔ یہ درس ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور، میں ہر جمعہ کی صبح ½ ۹ بجے ہوتا ہے، اور مختلف شہروں کی بزم ہائے طلوع اسلام کے زیراہتمام "ٹیپ ریکارڈر" پر۔ انفرادی طور پر حسبِ فرمائش، ان درسوں کے ٹیپ (CASSETTES) بھی مہیا کئے جاسکتے ہیں۔ (ناظم — ادارہ طلوع اسلام لاہور)۔

——— (۰) ———

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غیر مذہبی باتیں

(منظور احمد خان - ناروے)

(نوٹ : مدیر مسئول کا غیر مذہبی باتوں سے متفق ہونا بہت ضروری ہے-)

پتھر کا زمانہ' بڑا سنگین زمانہ تھا- تب سنگساری بھی عام تھی' اب تو اس کی بات کرنا بھی عام نہیں ہے تاہم کہیں کہیں کوئی پتھر ذہن یا سنگدل اس زمانے کی سنگینی قلب کی یاد دلا دیتا ہے کہ بہرحال اپنی تاریخ یعنی انسانی تاریخ کو اتنی جلد فراموش کر دینا بھی کوئی آسان کام نہیں------ یہ زمانہ کم و بیش 5 لاکھ سال قبل مسیح سے لیکر 2000 سال قبل مسیح تک پھیلا ہوا ہے (ارتقائے ذہن کی رفتار ملاحظہ فرمائیں)-

پھر خدا خدا کر کے کانسی کا زمانہ آیا' جو کبھی تانبا' کبھی ٹین اور کبھی دونوں کو جوڑ کر کانسی کی شکل میں حضرت آدم کے گلے پڑا رہا- کانسی کے زیورات عام تھے- یہ زمانہ کم و بیش 2000 سال قبل مسیح سے لیکر 500 سال قبل مسیح تک اپنی پوری آب و تاب کیساتھ قائم رہا- اس زمانے کی شکار بھی بے چاری عورت ہی رہی؟ ہر نئی اور کمیاب چیز کا پہلا تجربہ گویا عورت پر ہی کیا گیا------ آج بھی---- مختلف ذرائع ابلاغ کی بدولت پہلا نشانہ بیچاری حوا کی بیٹی ہی کو بنایا جاتا ہے- یہ سرمایہ دار ذہنیت اس بیچاری کی سادہ لوحی سے بڑا ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہے اور یہ لاچار مسلسل استعمال ہو رہی ہے- ہر تیسرے چوتھے مہینے اسے ملبوسات کا فیشن طوعاً" کرہاً" بدلنا پڑ جاتا ہے- مالدار خواتین تو Out Of Fasion ملبوسات پھینک کر' اگلے ہی دن نئے جوڑے سلوا لیتی ہیں یا ریڈی میڈ خرید کر .MOD کہلانے کی مستحق ہو جاتی ہیں- سفید پوش خواتین زمانے کا ساتھ دینے کے لئے پرانے کپڑوں کی ادھیڑ بن میں جت جاتی ہیں- کیا کریں مجبوری ہے-

یورپ کی خواتین 100 فی صد پڑھی لکھی ہیں- لاشعوری طور پر نشانہ یہ بھی بن رہی ہیں تاہم یہ اتنی بھولی نہیں کہ جونہی TV پر کسی محترمہ نے نئے فیشن کے سوٹ یا "جوتے کی جھلک" دکھائی اور یہ بیٹھ گئیں سب کچھ ادھیڑنے-- میں گذشتہ 20 سال سے یہاں مقیم ہوں- یہاں کی مستورات جی نہیں مستورات تو یہاں ہوتی ہی نہیں' خواتین نے اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتوں' یعنی فیشن زدگی وغیرہ سے جان چھڑا لی ہے- یہ الگ بات ہے کہ یہ کئی دوسری قبیح رسوم کی طرف اندھا دھند بڑھ گئی ہیں--- اور تسلیم بھی کرتی ہیں کہ

ہم نے بہت کچھ گنوا دیا ہے- خارجی علم پر مبنی مستقل اقدار سے تو یہ مکمل طور پر تہی دست ہو چکی ہے- میرے نزدیک اس میں قصور بہرحال مردوں کا ہے کہ یہی نکلے تھے پہلے میدان میں- اس ویرانیٔ چمن کا باعث ان کی نام نہاد "مردانگی" ہے- ان بے چاروں نے لفظ 'مرد' کا مطلب و مفہوم جاننے کی کوشش ہی نہیں کی' ورنہ یہ جاننا مشکل نہ تھا کہ مرد صرف مذکر کا صیغہ ہی نہیں' یہ صرف اسم ہی نہیں' یہ اسم صفت بھی ہے کہ مردانگی صرف مردوں ہی میں نہیں پائی جاتی (بلکہ ضروری نہیں ہے کہ پائی بھی جائے) یہ صفت مومن خواتین میں بھی پائی جا سکتی ہے- آج کل اس کے بڑے کھلے ثبوت جگہ جگہ مل رہے ہیں- ظاہر ہے کہ ثبات مثبت کو ہے' منفی کو نہیں- دھات کا زمانہ گذرا' دھات کے زیورات کا بوجھ یہ کمزور و ناتواں ہی اٹھاتی رہی- پھر آیا لوہے کا زمانہ' جو اب تک قائم و دائم ہے- گو کہ ATOM نے بڑے ٹکڑے کیے ہیں اس کے-----

سوال یہ پیدا ہوا ہے کہ پتھر کے زمانے سے پہلے کیا تھا؟ اور ایٹم (ATOM) کے زمانے کے بعد کیا ہو گا؟ جواب آسان ہے- "وہی ہو گا جو منظور خدا ہو گا"- اللہ اللہ تے خیر سلا- جس زمانے سے ہمارا تعلق ہی نہیں' بھلا اس کے بارے میں سر کھپانے سے فائدہ؟- بڑی خوبصورت بات ہے' جس نے بھی کہی ہے' سچ ہے کہ "پتھر پیدا ہونے سے پہلے بھی خاک تے مٹی اور ایٹم کے پھٹنے سے بعد بھی خاک تے مٹی----- اگر اسی طرح پاگلوں کے ہتھے چڑھا رہا" ہمیں آج کی خبر لینی چاہیے- مستقبل قریب کی خوشگواریوں کیلئے' آنے والی نسلوں کی فلاح و بہبود کیلئے- مستقبل بعید یا آخرت خود بخود سنور جائے گی- یہی قانون فطرت ہے-

ان دور از کار سوالات کے حوالے سے بڑی دلچسپ باتیں یاد آ رہی ہیں- گاہے گاہے تفننِ طبع کے طور پر لکھتا رہونگا- آج ایک ہی پر اکتفا کرتا ہوں-

یہ ہمارے اوارے کے مدیر مسئول جناب محمد لطیف چوہدری صاحب بڑی خاص چیز ہیں- یہ انتہائی خوبصورت حسن اتفاق تھا کہ انکے ماں باپ نے انکا نام لطیف رکھا- واضح رہے کہ لطیف کا مطلب ہلکا نہیں ہوتا- اسکا مطلب صرف لطیف ہی ہوتا ہے- یہ ثقیل کا متضاد ہے اور ثقیل' ثقیل ہی ہوتا ہے چاہے وہ پہاڑ ہو یا چند لفظی فقرہ- جنوری 60ء کی بات ہے' یہ ایک کھیت کے کنارے گاؤں میں بیٹھے سرما کی دھوپ تاپ رہے تھے' فوج سے ریٹائر ہونے کے بعد شاید کسی نئی منزل کی تلاش میں تھے- کھیت کے دوسرے کنارے ایک آشنا سرمست چودھری کو گھوڑی پر بیٹھے شہر کو جاتے دیکھا- گھوڑی دیکھ کر چونکے کہ یہ تو چوری ہو گئی ہوئی تھی- فوراً چودھری صاب کو چیخ چیخ کر پکارنے لگے- "چودھری صاحب ادھر آئیں' بڑی ضروری بات ہے- ادھر آئیں ! چودھری صاحب بڑے پریشان ہوئے- وہ پہلے ہی جلدی میں تھے- لیکن لطیف صاحب کا اصرار برقرار رہا اور چودھری صاحب کو لمبا چوڑا کھیت عبور کر کے ادھر آنا پڑا- ان کے قریب آنے پر یہ پوچھنے

لگے: "یہ گھوڑی واپس مل گئی ہے آپکو؟" چودھری صاحب کا پارہ اور چڑھ گیا۔ تم دیکھ نہیں رہے کہ میں اس پر سوار ہوں؟ ظاہر ہے مل گئی ہے تبھی اس پر سوار ہوں۔ اور مجھے یہ بتاؤ بھلے آدمی کہ کیا صرف یہ پوچھنے کیلئے مجھے اتنی دور سے یہاں بلایا ہے؟

لطیف صاحب کی لطافت پھڑکی اور کہنے لگے: "چودھری جی! پوچھ لینے میں بھلا کیا حرج ہے؟"

اس قسم کی "پوچھ گچھ" مذہبی باتیں کہلاتی ہیں' جن سے لطافت کا کام تو یقیناً لیا جا سکتا ہے کہ زمانہ بڑا کرب و الم انگیز حالات میں جا رہا ہے۔ لہٰذا لطیف و لطافت کی بھی اتنی ہی ضرورت ہے۔ لیکن ان باتوں میں سارے کا سارا وقت صرف کر دینا--- شاید ہمارا ہی جگرا ہے یا صرف پتھر کے زمانے کے وہ بھلے لوگوں کا--- اس زمانے سے پہلے کیا تھا اور اس زمانے کے بعد کیا ہو گا' سوال یہ نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ حضرت انسان اسقدر لمبی چوڑی مسافت طے کر کے اب تک کیا یہیں پہنچ پایا ہے؟ اتنی بڑی عمر کا آدمی اور ذہنی سطح اسقدر پست؟ ہاں یہ بات آج سمجھ میں آگئی کہ زندگی اور عمر میں کیا اور کتنا فرق ہے------ یہ فرق جتنا لطیف ہے اتنا عمیق بھی ہے۔

؎ کوچہ عشق اور شہر ہنر کے بیچ صرف ایک گلی ہے
پل بھر رستہ طے کرنے میں پوری عمر لگی ہے

آؤ! اب بھی وقت ہے' زمانوں کی جگر خراش مسافتوں اور ان کے فریب انگیز سرابوں اور غیر ضروری باتوں سے نکل کر آج کی بات کریں اور کام کی بات کریں۔ آؤ غور کریں' تحقیق کریں--- کیا؟

میں کون ہوں؟ کب سے چلتا آرہا ہوں' کدھر جا رہا ہوں؟ اور کیوں؟ رک جایئے تھوڑی دیر کیلئے خدا کیلئے رک جایئے اور ____ سوچئے! میں کون ہوں؟ میرا تشخص کیا ہے؟ میری ____ identity کیا ہے؟

منزلیں راستوں کی دھول ہوئیں — پوچھتے کیا ہو تم مسافت کی
اتنا مشکل نہیں تجھے پانا — اک گھڑی چاہیے ہے فرصت کی
یاد آئی تو ہے شناخت مگر — انتہا ہو گئی ہے غفلت کی

بات ہو رہی ہے مشہود و موجود کائنات کی' معروضی حالات کی' میری اور آپ کی۔ کہیں بعد الطبیعیات (Metaphysics) یا فلسفے کی طرف نہ نکل جانا' خبردار! یہ صوفیانہ باتیں ہیں اور سوچنے کو وقت بہت کم۔ ورنہ پروفیسر جوڈ (C.E.M. JOAD) کی طرح آپ کو بھی مایوس ہی ہونا پڑے گا۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی فکر کی کم مائیگی کا اندازہ لگایئے کہ:

(1) روئے زمین پر زندگی کے آثار قریباً (1,200,000,000) ایک بلین اور 2 سو ملین سال پیشتر نمودار ہوئے۔

(2) انسانی زندگی قریب دس لاکھ سال پہلے نمودار ہوئی (خاک تے مٹی کا زمانہ)۔
(3) انسانی تہذیب قریب 3 ہزار سال سے پیدا ہوئی۔

اس حساب سے وہ لکھتا ہے کہ یوں سمجھئے کہ اگر روئے زمین پر زندگی کی نمود کو سو سال کا عرصہ لگا' تو انسانی زندگی کا عرصہ ایک ماہ رہ جاتا ہے اور انسانی تہذیب دو گھنٹے سے ذرا زیادہ کی عمر کی رہ جاتی ہے۔

ہائے اس زور پشیماں کا پشیماں ہونا

سوچنے کی بات ہے۔ جمادات و نباتات سے متعلق نہیں یا کم از کم فی الحال نہیں' ترجیحات کے اصول کی رو سے سوچنے کی بات حیوانات سے متعلق ہے جس میں ہم بھی شامل ہیں----- ہم کون ہیں؟ کیا ہیں؟ کیوں ہیں؟۔

مثلاً ایک ماسٹر صاحب نے پوچھا: اچھا بچو! بتاؤ کہ پاکستانی کسے کہتے ہیں؟
شاگرد: یہ بھی کوئی سوچنے کی بات ہے؟ پاکستانی' پاکستان میں رہنے والے کو کہتے ہیں اور بس۔
ماسٹر صاحب: پاکستان میں تو امریکن (بھی) رہتے ہیں؟
شاگرد: یہ البتہ سوچنے کی بات ہے۔
(ضرور سوچئے اور اگر کچھ "پلے پڑ جائے" تو ہمیں بھی بتایئے۔ مدیر)

معزز قارئین!

اگر آپ کا زر شرکت برائے سال 1994ء ختم ہو چکا ہے۔ اور آپ نے ابھی تک ہمیں اطلاع نہیں دی۔ تو آپ سے گذارش ہے کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے اپنا زر شرکت ارسال فرمادے تاکہ پرچے کی ترسیل منقطع نہ ہو۔

پرچہ بذریعہ VPP صرف آپ کی ہدایت پر بھجوایا جائیگا۔
پیشگی کھاتوں سے جاری ہونے والے پرچے بدستور جاری رہیں گے۔
ادارہ آپ کے تعاون کے لئے شکر گزار ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

اطلاع عام

جیسا کہ پہلے بھی اطلاع دی جا چکی ہے۔ پاکستان میں محکمہ ڈاک کوڈ نمبر کے بغیر پرچہ لینے سے انکار کر دیا ہے۔ قارئین کرام سے بار دگر التماس ہے کہ وہ فوری طور پر اپنے علاقے کوڈ نمبر سے مطلع فرمائیں۔

ادارہ طلوع اسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فکر پرویز کی اصل قدر و قیمت

بجواب

پرویز صاحب کی اصل غلطی

(ابو منیب راشد)

تمہید

جناب جاوید الغامدی صاحب کی زیر ادارت چھپنے والے ماہنامہ اشراق لاہور کے شمارہ ستمبر 1990ء میں جناب خورشید احمد ندیم صاحب کا ایک مضمون "پرویز صاحب کی اصل غلطی" نظر سے گزرا۔ جسے پڑھا اور بار بار پڑھا۔ کیونکہ ہمارے نزدیک جناب پرویزؒ کے فکر میں پاکستان کے الجھے ہوئے گھمبیر مسائل اور معموں ہی کا حل نہیں بلکہ ہمیں یقین ہے کہ اس میں کل کی کل نوع انسانی (خواہ وہ مشرقی ہو یا مغربی) کے مسائل کا حل پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ فکرؒ پرویز کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عقل انسانی اور کتاب اللہ کے مابین صحیح ترین ادراک و امتزاج پایا جاتا ہے۔ اس فکر میں ہمارے اسلاف کی اعلیٰ فکری روایات کا تسلسل بھی ہے' اور اس منزل کے آثار و شروعات بھی' کہ جہاں پر نوع انسان نے پہنچ کر انجام کار اپنے شرف و مجد اور آسودگی و بہبودگی جسم و جان سے آراستہ و پیراستہ ہونا ہے۔ یہی وہ فکر ہے کہ جو ایک طرف تخلیق حیات و کائنات کے سربستہ رازوں کو آشکارا کرتی ہے۔ تو دوسری طرف انسانی ذات' انسانی سوسائٹی اور خلافت آدم کے ان نصب العینی تقاضوں کی تسکین و تشفی کا وافر سامان مہیا کرتی ہے کہ جن کے مہیا نہ ہونے کی وجہ سے روس جیسے عظیم پرولتاریہ کی شان و شوکت پارہ پارہ ہو چکی ہے۔ اور جس کے نہ ہونے کی وجہ سے امریکی استعمار کبھی بھی ورلڈ آرڈر کے عظیم خواب کو شرمندۂ تعبیر نہیں کر سکے گا۔ اور کسی حد تک اس نے اس حوالے سے کامیابی حاصل کر بھی لی تو ڈھلتی چھاؤں اور ڈوبتے سورج سے زیادہ کچھ نہ ہو گی۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ کل نوع انسانی کا اجتماع عظیم نیو ورلڈ آرڈر کا انسانی خواب تو ضرور شرمندۂ تعبیر ہو گا۔

گئی تھی۔ یہ خلاق و علیم اللہ تعالیٰ کا ٹھہرایا ہوا نصب العین ہے۔ اور حیات و کائنات کے عظیم سلسلے بتدریج اسی کی طرف خراماں خراماں نوع انسانی کو لئے جا رہے ہیں۔ لیکن اس حسین خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کیلئے جن خود آگاہ و خدا مست انسانوں نے فکری و نظریاتی جہادِ عظیم کیا ہے' ان کے فکری و نظریاتی ورثہ سے صرفِ نظر کرتے ہوئے یہ ادھورا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ اس خواب کو حقیقت کا روپ عطا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی مشیت قاہرہ سے ماہ رمضان کی لیلتہ القدر میں پاکستان کا قیام ہوا ہے۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ نے اس کے لئے عملی جدوجہد کا فریضہ انجام دیا ہے۔ حکیم الامت علامہ محمد اقبالؒ نے اس کے لئے فلسفیانہ و مابعد الطبیعی بنیادیں فراہم کی ہیں۔ اور جناب پرویزؒ نے ان علمی و نظریاتی مشکلات کو حل کرنے کی علمی و نظریاتی راہنمائی کی ہے' جو دین سماوی کے پاکستان میں نفاذ و قیام کے راستے میں سنگ گراں کے طور پر حائل ہیں۔ پاکستان آج جن جن فکری و نظریاتی الجھنوں کا شکار ہے' اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ یہاں کے حکمرانوں نے دیدہ دانستہ طور پر بانی پاکستان محمد علی جناحؒ مفکر پاکستان علامہ محمد اقبالؒ اور مفکر قرآن جناب پرویزؒ صاحب کی نصب العینی جدوجہد سے انحراف اختیار کئے رکھا ہے۔ لیکن اب آہستہ آہستہ وہ نوجوان نسل پروان چڑھ چکی ہے جس نے ان تینوں منبعوں سے جی بھر کر کسب فیض اور اقتباس ضیاء کیا ہے۔ اب پاکستان کے اصل وارث بیدار ہو رہے ہیں۔ آج کا دور' دور فکر پرویز ہے۔ فلہذا اسے گمراہی قرار دینے والے افراد اور اداروں کا فکری و نظریاتی تعاقب کرنا ہمارا مقدس فریضہ ہے۔ اسی فریضہ کی ادائیگی کے لئے یہ چند اوراق پیش خدمت ہیں۔ وباللہ التوفیق۔

پرویز صاحب کی اصل غلطی "پرویز کی اصل گمراہی" اور ان کے گمراہ ہونے کے آج جو عنوان قائم کئے جا رہے ہیں' ان کا اپنا ایک پس منظر ہے۔ انسانی ظن و گمان اور خود ساختہ روایات کے قصر مشید دھڑام سے گرتے نظر آ رہے ہیں۔ پرویزؒ صاحب کے ہاں جن جن امور کو اصل گمراہی ٹھہرایا جارہا ہے یہ گمراہی نہیں ہیں۔ <پرویز صاحب کی اصل غلطی یہ نہیں ہے۔ بلکہ ان کی اصل غلطی یہ ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک سانس اور اپنے آرام و متاع حیات کا ایک ایک ذرہ خدمت کتاب اللہ کیلئے وقف کئے رکھا۔ وہ پرویز کہ جس نے اکابر و اسلاف پرستی سے جب اپنا دامن چھڑا لیا' جب اس نے تقلیدی اعمی سے کام لینے سے انکار کر دیا' جب اس نے عجمی اسلام اور ملوکیت زدہ مذہب کی اصل حقیقت کو پہچان لیا' جب اس پر مذہب اور دین کے امتیازات روز روشن کی طرح عیاں ہو گئے' جب اس نے اطاعت رسولؐ کے قرآنی مفہوم و مدلول کا سراغ لگا لیا' جب اس نے قرآنی دین' نبوی اسلام اور حیات و خرد افروز مسلک حیات سے آگاہی حاصل کر لی' جب اس نے ملوکیت کے استبداد (فرعونیت) مذہبی پیشوائیت کے جبر و اکراہ (ہامانیت) اور سرمایہ

داریت و جاگیرداریت کے ظلم و استحصال (قارونیت) کو اچھی طرح پہچان لیا' تو اس نے تن تنہا ان کے خلاف فکری و نظریاتی جنگ کا اعلان ہی نہیں کیا' بلکہ اپنی پوری زندگی کو اسی جہدِ عظیم کیلئے وقف کر دیا۔ وہ شخص کہ جو اپنی ذات میں ایک انجمن تھا۔ وہ سرمایہ شکن اور طاغوت کش دعوت و پروگرام کا نقیب تھا۔ لیکن وہ کسی سرمایہ دار یا جاگیردار کے وظیفوں پر پلنے والا نہ تھا۔ لیکن اس نے اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت اور اپنی ذات اور اپنے مشن کی صداقت اور اپنے مخلص رفقاء کے حسنِ تعاون سے آسمانی قرآنی قندیل کو روشن رکھا۔ اور وہ اپنے خونِ جگر سے اس مزرعِ حیات کی آبیاری کرتا رہا۔ اسے اس قرآنی شمع کو فروزاں رکھنے سے نہ تو ملوکیت کا استبداد روک سکا اور نہ ہی مذہبی پیشوائیت کے مشرقی و مغربی نمائندوں کے فتاویٰ ہائے کفر و ارتداد ہی اس کے پائے استقامت میں کوئی ادنیٰ ترین لغزش پیدا کر سکے۔ ہمیں کتنے ہی وہ معرکے یاد ہیں کہ مذہبی پیشواؤں نے دیال سنگھ کالج کے لیکچر ہال اور وائی ایم سی اے ہال جیسے مقامات پر شور و غل پیدا کر کے اس کی قرآنی آواز کو دبانے کی کوشش کی لیکن وہ کوہ استقامت پورے جاہ و جلال کے ساتھ قرآنی آواز کا ارتعاش پیدا کرتا رہا۔ حتیٰ کہ جن دنوں مذہبی پیشواؤں کے فتاویٰ ہائے کفر و ارتداد کے چھپ جانے کی وجہ سے فضاء میں کافی تکدر پایا جاتا تھا اور جامعہ اشرفیہ سے کئی ایک باریش بزرگ اور طلباء درس قرآن سننے کے بہانے پرویزؒ صاحب کے ہاں حاضری دیا کرتے تھے' اس وقت بھی کئی اہل درد احباب کا تقاضا ہوتا تھا کہ درسِ قرآن کو فی الحال روک دیا جائے۔ لیکن 25- بی گلبرگ کا مقدس ماحول گواہ ہے کہ پرویزؒ صاحب نے اس حوالے سے درس کا ناغہ کرنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ پس آج تک وہ شاہدان حال بطور گواہ موجود ہیں جو ان دروس میں شریک ہو کر اپنی قرآنی تشنہ لبی کا سامان اور اپنے قرآنی کام و دہن کا متاع گرانمایہ حاصل کیا کرتے تھے۔

پس پرویزؒ صاحب کی اصل غلطی یہ ہے کہ وہ حاکمیتِ قرآن کے داعی تھے۔ وہ تحریک رجوع الی القرآن کے نقیب تھے۔ وہ نظامِ ربوبیت کے ترجمان تھے۔ طاغوتی تثلیث کے مظاہر یعنی فرعون' ہامان اور قارون کے محلات اور ان کے مصنوعی جاہ و جلال کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جانے والے تھے۔ وحیٔ قرآن کے اپنانے میں نوعِ انسانی کی نجات و سعادت کے قائل تھے۔ صرف اتنی ہی بات نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر ان کا جرم یہ ہے کہ انہوں نے قرآن فہمی کی ایسی پختہ و پائیدار شاہراہِ حیات کی نشان دہی کی ہے کہ جس کے سنگ ہائے میل کے انوار و تجلیات سے ظلمت کدہ آدمیت بقعۂ نور بنا چاہتا ہے۔ آپ نے اپنی نہ تھکنے والی طبیعت اور اپنی ذات میں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ بے پایاں صلاحیتوں سے کام لیکر معارف القرآن۔ نظام ربوبیت۔ لغات القرآن۔ مفہوم القرآن۔ مطالب الفرقان۔ فردوس گم گشتہ۔ سلسبیل۔ ابلیس و آدم۔ کتاب التقدیر۔ انسان نے کیا سوچا۔ اسلام کیا ہے۔ بہار نور۔ جہان فردا۔ اسلام اے چیلنج ٹو ریلیجن۔ شاہکار رسالت۔ جیسی گرانقدر و عہد ساز کتابوں کی شکل میں فکر و بصیرت کی وہ گرانمایہ میراث چھوڑی ہے کہ جو تا ابد قافلہ ہائے

طلبائے قرآن کیلئے حدی خوانی کا فریضہ انجام دیتی رہے گی۔ کوئی شخص یہ گمان نہ کرے کہ ہم طلبائے قرآن جنابِ پرویزؒ صاحب کو معصوم مانتے ہیں یا ان کے بتائے ہوئے مفاہیم اور سمجھائے ہوئے مطالب کو وحی یا وحی کا بدل مانتے ہیں۔ حاشا و کلا نہ ہمارا یہ اعتقاد ہے اور نہ ہی کوئی پرویزؒ صاحب سے مستفید ہونے والا عالم یا عامی ایسے گمان میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ اور اگر کوئی ایسا گمان کرتا بھی ہے تو ہم ہی اس سے بیزار نہیں بلکہ خود پرویزؒ صاحب بھی اس سے بری الذمہ ہیں۔ کیونکہ وہی لغات القرآن کہ جس کا جناب ندیم نے حوالہ تو دیا ہے لیکن جس کا انہوں نے امعان و تدبر کے ساتھ قطعاً" مطالعہ نہیں کیا' اسی لغات القرآن کی چوتھی جلد کے آخری صفحہ پر اللہ تعالیٰ کے حضور تشکر و امتنان کا اظہار کرتے ہوئے پرویزؒ صاحب فرماتے ہیں۔ کہ "بہرحال یہ ایک انسانی کوشش ہے۔ جس میں سہو و خطا کا ہر وقت امکان ہوتا ہے۔ میں نے قرآن فہمی کے سلسلہ میں یہ ایک نئی طرح ڈالی ہے' دیگر اربابِ ذوق اور علم دوست حضرات مزید غور و تدبر سے اسے بہتر بنا سکتے ہیں"۔

اتنا ہی نہیں بلکہ پرویزؒ صاحب اس سے بڑھ کر ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"قرآنِ کریم میں غور و فکر کا سلسلہ تو کبھی ختم ہی نہیں ہو سکتا اس لئے اس باب میں کسی انسان کا قول بھی حرفِ آخر نہیں کہلا سکتا"۔

گویا پرویزؒ صاحب نے جو کچھ کہا ہے وہ نعوذ باللہ نہ تو وحی ہے اور نہ ہی اس کا بدل' البتہ وہ قرآن فہمی کے سلسلہ میں ایک ایسی کوشش ہے کہ جس کی قرون مشہود لھا بالخیر کے بعد صدیوں تک کوئی مثال نہیں ملتی۔ ہم سے قریب ترین عہد میں شاہؒ ولی اللہ دہلوی کے ہاں اس کے آثار ملتے ہیں۔ سرسید احمد خاںؒ نے اس مسلک کے لئے شاندار خدمات انجام دی ہیں۔ علامہ محمد اقبالؒ نے اپنے مکاتیب میں اس طرف مثبت اشارات کئے ہیں۔ محترم پرویز صاحب نے اسے ایک مستقل بالذات فن کے طور پر متعارف کرایا ہے۔ ان کا قائم کردہ یہ سلسلہ انشاء اللہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ یہ ظلمت کدۂ ارض' نظامِ ربوبیت و عبودیت کے انوار و تجلیات سے بقعۂ نور نہیں بن جاتا۔ اور اس طرح وہ آدم جو اپنی فردوسِ گم گشتہ کی تلاش میں نہ معلوم زمانوں سے ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھاتے ہوئے دوبارہ اس کے حصول و یافت کیلئے سرگرداں ہے دوبارہ اپنے حسنِ عمل اور حسنِ انتخاب' سعیٔ پیہم اور جدوجہدِ نااختتام کے نتیجہ میں اس کے خزاں ناآشنا ثمرات اور اس کے حسنِ لازوال سے متمتع ہونا شروع نہیں کر دیتا۔

پرویزؒ صاحب اور انکی فکری بلندی جہاں تک پرویزؒ صاحب کی فکری و نظریاتی بلندی کا تعلق ہے' تو اس کیلئے اتنا کہنا کافی ہے کہ ان کے فکری و نظریاتی ترفع کو وہ لوگ بھی خراجِ عقیدت ادا کر رہے ہیں کہ جنہوں نے دورِ حاضر کے افکار و تصورات کا نہایت ژرف نگہی اور جانکاہی سے مطالعہ ہی نہیں کیا بلکہ ان

کا ناقدانہ جائزہ بھی لیا ہے۔ اسی حوالے سے ہم یہاں اپنے ملک کے ایک جلیل القدر ادیب' شاعر اور مفکر کی رائے درج کرنا مناسب خیال کرتے ہیں۔ جناب ڈاکٹر خیال امروہوی پرویزؒ صاحب کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں کہ وہ (راقم) اپنی افتادِ طبع' مذاقِ تحقیق' سائنٹفک تفہیم اور جدلی منطق پسندی کے باوجود جناب غلام احمد پرویز کو عصرِ حاضر کا مستند ترین مفسرِ قرآن اور نادر محقق تصور کرتا ہے اور علی الاعلانیہ کہہ سکتا ہے کہ لغات القرآن' انسان نے کیا سوچا' تبویب القرآن اور نظام ربوبیت' جیسی تخلیقات کے بعد قرآن حکیم صرف دم ودرود تک محدود نہیں رہ جاتا' بلکہ حکمت و دانش کے مرقع اور دستورِ حیات کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ چنانچہ قرآنی فرمودات کی معاشرتی زندگی سے تطبیق اور صدیوں قبل کے الوہی اور مابعدالطبعی تارِ عنکبوت سے انسان کو نجات دلانے میں سرسید احمد خاں کے بعد اگر کسی شخصیت کی ضرورت تھی' تو وہ جناب غلام احمد پرویز ہی کی کہی جا سکتی ہے"۔ (نئی سوچ صفحہ نمبر 73 از ڈاکٹر خیال امروہوی شائع کردہ کلاسیک دی مال لاہور)

اب آیئے جناب ندیم اور ان کے رشحاتِ قلم و فکر کی جانب کہ یہ دیکھیں کہ انہوں نے جناب پرویز صاحب کے بارے میں کیا کیا گوہر افشانیاں کی ہیں!

مقالے کے اختتام پر ارشاد ہوتا ہے:

"بعض لوگوں کے نزدیک پرویز صاحب کے فکر میں پائی جانے والی سب سے بڑی ضلالت انکار حدیث ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک انہوں نے قرآن فہمی کے جو اصول متعین کئے ہیں وہی ان کی گمراہی کا بنیادی سبب ہیں۔ قرآن مجید سے غلط استدلال کی وجہ سے انہوں نے بے شمار چیزوں کا انکار کیا ہے۔ حدیث' معجزہ' جنات وغیرہ کا شمار اسی فہرست میں ہوتا ہے۔ اگر وہ قرآن کو صحیح اصولوں کی بنیاد پر سمجھتے تو انہیں ان سب کا ثبوت قرآن ہی سے مل جاتا۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور منصبِ رسالت کو ایک واضح اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ ان تصورات کو جان لینے کے بعد ان چیزوں کے انکار کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا"۔ (اشراق ستمبر 90 صفحہ 55)

اس عبارت میں جو تعلی اور جس بڑے پن کا اظہار پایا جاتا ہے۔ اسے ہر قلب حساس بہت اچھی طرح جان سکتا ہے۔ پھر اس بیمار ذہنیت کا اظہار اس شمارے کے ٹائٹل کے صفحہ پر بھی بایں انداز ہوا ہے کہ "پرویز صاحب کی اصل غلطی" وغیرہ۔

اب مناسب تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان اصولوں کا ذکر یہاں ذرا تفصیل سے کرتے کہ جنہیں پرویزؒ صاحب نے قرآن فہمی کے حوالے سے اپنے پیشِ نظر رکھا ہے اور پھر جناب ندیم سے سوال کرتے کہ وہ متعین طور پر بتائیں کہ وہ ان میں سے کس کس کو سب سے بڑی ضلالت قرار دینے کی جرأت و جسارت

کرتے ہیں اور اسی طرح ہم ان اصولوں کی جانب بھی ہلکا سا تنقیدی اشارہ کر دیتے کہ جو بقول' ان کے استاد امام امین احسن اصلاحی صاحب نے اپنے پیش نظر رکھے ہیں اور جنہیں بروئے کار لا کر انہوں نے بقول ان کے ان مداحوں کے "تدبر قرآن" جیسا وہ شاہکار جنم دیا ہے کہ جو خود کئی ایک تضادات اور فروگذاشتوں سے مالا مال ہے۔ نیز ہم بتاتے کہ ان صحیح اصولوں پر کاربند ہونے والے "افلاطونِ وقت" نے حدیث' معجزے' اور جنات کے بارے میں جو جو عجوبہ کاریاں کی ہیں وہ کہاں تک اکابرین سلف کے منہاج سے مطابقت رکھتی ہیں۔ لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ اس صورت میں ہمارا یہ مقالہ بے حد طویل ہو جائیگا۔ جو شائد ماہنامہ کے صفحات اور اس کی گنجائش سے بھی باہر ہو جائے۔ اس لئے فی الحال ہم انہیں نکات تک اپنے آپ کو محدود رکھیں گے کہ جنہیں جناب ندیم نے اپنے ترکش کے تیروں کا نشانہ بنانے کی سعیٔ لاحاصل کی ہے۔

I- جناب ندیم نے پرویزؒ صاحب کے اندازِ استدلال کا مذاق اڑانے کیلئے اور طلبائے قرآن کے سامنے انہیں (کودک) نادان کے طور پر پیش کرنے کے لئے چند ایک لچر اور لایعنی مثالوں کا سہارا لیا ہے۔ محترم کا مذاق اڑاتے ہوئے یہ یوں گوہر افشانی کرتے ہیں کہ "اگر کوئی شخص شوربا (جو کہ سالن ہے) کے لفظ کی تحلیل کرتے ہوئے اسے شور اور با کا مرکب قرار دے۔ اور اس کا معنی نمکین پانی قرار دے' تو کیا اس کا یہ استدلال قابل قبول ہو گا۔ (ص 47) جواب ہے' ہرگز نہیں۔ کیونکہ اس حوالے سے سب سے پہلے تو سوال یہ ہو گا' کہ اردو یا ہندی زبان میں یا جس زبان کا بھی یہ لفظ ہے' اس میں اس کے اصل معنی کیا ہیں۔ نیز اس کے بارے میں یہ جاننے کی کوشش کی جائیگی کہ یہ لفظ مرکب ہے یا مفرد یا یہ لفظ عام ہے یا خاص یا اصطلاح' اگر یہ ایک خاص اصطلاح ہے تو یہ کس فن کی اصطلاح ہے اور اصحاب فن نے اس کی اپنے ہاں کیا تعریف وضع کر رکھی ہے۔ پس ان امور کا جواب دیئے بغیر ہم شوربا اور اس جیسے دوسرے الفاظ کے بارے میں کسی بھی رائے کا اظہار کرنے سے قاصر رہیں گے"۔ لیکن اب سوال یہ ہے کہ جناب پرویزؒ نے لغات القرآن یا مفہوم القرآن میں کوئی ایسی لچر و بے بنیاد بات کہی ہے تو اسے زیر بحث لانا چاہئے تھا۔ پس کسی ایسی مثال کو ان کے پیدا کردہ لٹریچر سے سامنے لائے بغیر مجرد اس طرح کی لچر مثالیں گھڑ کر پیش کرنا اور پھر اسے پرویزؒ صاحب کی طرف منسوب کرنا یقیناً بدنیتی اور طعن و استہزاء کی وہ بدترین مثال ہے کہ جس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ سوال یہ ہے کہ اہل زبان جب الفاظ وضع کرتے ہیں اور کسی زبان کے ارباب فن جب وضع اسماء یا اصطلاح سازی کا فریضہ انجام دیتے ہیں' تو کیا ان کے سامنے عقل و منطق کی کوئی منہاج نہیں ہوتی۔ کیا وہ اناپ شناپ ایسے ہی اس مرحلے کو طے کر لیتے ہیں۔ اور اندھا دھند طریقہ سے ان کا منہاج قبولیتِ عامہ اور رواج عام کی سند حاصل کر لیتا ہے۔ یقیناً ایسا نہیں ہے۔ ذرا اس شوربا کے لفظ ہی کی طرف آیئے جیسا کہ ندیم صاحب

نے کہا ہے کہ شوربا کا از روئے لغت معنی ہے۔ نمکین پانی۔ برائے کرم اردو زبان کا کوئی سا لغات اٹھا کر دیکھئے۔ فرہنگ آصفیہ۔ نوراللغات۔ لغات نول کشور' نہیں تو کم از کم فیروز سنز کا فیروز اللغات اردو ہی اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ کیا کسی ایک نے بھی شوربا کا معنی مجرد نمکین پانی لکھا ہے۔ اگر ایسا ہے تو آپ سچے ہیں اور آپ کی بات بھی سچی ہے اور آپ کا استدلال قوی ہے۔ لیکن اگر کسی لغات میں بھی ایسی بے تکی بات نہیں ہے تو آپ کو اپنی اس جرأت و جسارت پر کچھ تو ندامت محسوس کرنی چاہئے۔

ہاں برادرم جایئے اور دنیا جہاں کے اصحاب فن اور عقلائے وقت کی رائے لیجئے اور ذرا ان سے پوچھئے کہ کیا جس چیز پر شوربا کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ خواہ وہ پتلا ہو یا گاڑھا۔ خواہ وہ مرغ کے گوشت کا ہو یا چنے کی دال کا۔ کیا وہ میٹھا ہو سکتا ہے۔ میٹھے محلول یا سیال شیرس کو کبھی بھی شوربا نہیں کہا جائیگا۔ شوربا کا لفظ جب بھی بولا جائیگا۔ اس میں نمکینی کا پایا جانا از بس ضروری اور اٹل ہے۔ لہٰذا آپ میں طاقت ہے تو اس کا انکار کر کے دیکھئے۔ ابھی آپ کو اپنی قدر و قیمت کا اندازہ ہو جائیگا۔

ہاں جناب ندیم صاحب! آیئے ذرا اس نکتہ پر غور کریں کہ جب ہم کسی چیز کو آبجو (جو کا پانی) یا عرق گلاب کہتے ہیں تو کیا وہ گندم کا پانی یا سورج مکھی کے پھولوں کا عرق ہو سکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ ہر زبان میں اسماء سازی کا کام اور اصطلاح سازی کا فن نہایت حکمت و دانش سے پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ اور مزید برآں یہ کہ اگر اصطلاح سازی میں اربابِ فن جلد بازی یا کسی کوتاہی کا مظاہرہ کرتے ہیں تو اس کا خمیازہ انہیں ضرور بھگتنا پڑتا ہے۔ اور ایسے الفاظ زبانوں میں ثقل یا بھاری بھرکم پیدا کرنے کا باعث بن جاتے ہیں۔ اس طرح ایسے الفاظ کبھی بھی عوام میں چلن یا رواج عام کا مقام حاصل نہیں کر پاتے۔ حکومت پنجاب کے شعبہ زبان دفتری کی وضع کردہ اصطلاحات کا حال جا کر معلوم کر لیں حالانکہ ان کو وضع کرنے کے دوران انتہائی بالغ نظر اور جہاندیدہ بزرگوں کی خدمات حاصل کی گئی تھیں پس آپ سے ہماری گذارش ہے کہ شوربے جیسی مثالوں کا سہارا لیکر قرآن فہمی کی اس شاندار فکری جدوجہد کا استخفاف نہ کریں کہ ہو سکتا ہے کہ کل کلاں آپ کو نہیں تو آپ جیسے دوسرے احباب اور آپ کے بعد آنے والی نسلوں کو لازماً" اس سے کسبِ فیض اور اقتباسِ ضیاء کرنا ہے اور بس۔

II- اسی طرح کی ایک دوسری مثال ٹیلی ویژن کی دی ہے (ص 47) سوال یہاں بھی وہی ہے کہ اصحاب فن اور ماہرین زبان نے جس چیز یا آلہ کا نام ٹیلی ویژن قرار دیا ہے' کیا یہ اسم با مسمّٰی ہے یا نہیں۔ یعنی یہ کہ ٹیلی ویژن کے لفظ میں انتقال مناظر کا مفہوم پایا جاتا ہے یا نہیں۔ کیا ٹیلی ویژن کے لفظ سے جو مفہوم بربنائے لغت حاصل ہوتا ہے۔ وہ صحیح ہے یا نہیں۔ کیا بھلا ٹیلی ویژن کے لفظ کے ابتدائی و بنیادی مفہوم تک رسائی حاصل کرنے کیلئے ہمارے لئے واجب ہے کہ ہم انگریز قوم کی اس وقت کی تاریخ کو

کھنگال لیں کہ جب اس کے اندر ابھی نشاۃ ثانیہ کے کوئی آثار تک ظاہر نہ ہوئے تھے۔ جب وہ اپنے دورِ وحشت و بربریت اور ظلم و جہالت کی اتھاہ تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کیا بھلا ٹیلی ویژن کے مفہوم کو پانے کے لئے ہمارے لئے واجب ہے کہ ہم شیکسپیئر' ورڈز ورتھ' ٹنی سن' شیلے اور بائیرن جیسے انگریزی زبان کے قدیم و جدید شعراء کے دواوین کو کھنگال مارنے میں اپنے شب و روز ضائع کر دیں۔ اگر جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب لاریب کا مطالعہ کرنے کیلئے ہم جاہلی و مخضری شعراء عرب کے ان دواوین کو پڑھنے پر کیسے مجبور ہو سکتے ہیں کہ جن کے اصلی یا جعلی ہونے کا بھی ہم فیصلہ نہیں کر سکتے۔ مقامِ افسوس ہے کہ وہ کتابِ عظیم کہ جس کے مصنف علام (اللہ تعالیٰ) کا دعویٰ ہے کہ قرآن حکیم اور شعر و شاعری کے مابین وہی نسبت و تناسب ہے جو نور و ظلمت میں ہے (36/69) جس کا اعلان ہے کہ اس نے اپنے رسولؐ کو شعر و شاعری کی تعلیم دی ہی نہیں کیونکہ وہ اس کی شانِ عظیم سے کوئی لگا ہی نہ کھاتی تھی (36/699) اس کتابِ لازوال اور منبع حکمتِ بے مثال کو عربِ جاہلیت کے ادب جاہلی اور پھر وہ بھی اس کے جاہل شعراء کے دواوینِ مکذوبہ و مصنوعہ کا محتاج قرار دینا بدترین ظلم نہیں تو اور کیا ہے؟ کیا یہ بے ہودہ و ناروا جسارت نہیں ہے کہ جس کی جتنی بھی مذمت کی جائے وہ کم ہے۔ ہم انشاء اللہ اگلی اقساط میں ان نمونہ ہائے فکر و فن کو اپنے قارئین کے سامنے لائیں گے جو ان مشتاقانِ شعراء جاہلیت نے قرآنِ حکیم کی نورانی محفل میں ناخواندہ مہمان کے طور پر لانے کی کوشش کی ہے۔

حقیقت و مجاز حقیقت و مجاز کے استعمالات پر گفتگو کرنے کے دوران مجاز کے تعین میں جناب ندیم صاحب نے لغت کے تصرف سے معانی کے بگڑ جانے کے حوالے سے جو مثال دی ہے اور اس مثال سے جو مفہوم انہوں نے اخذ کیا ہے' حقیقت یہ ہے کہ اس کی جس قدر بھی داد دی جائے کم ہے۔ عقل و حکمت کے تمام دفاتر اس مثال اور اس سے اخذ کردہ مفہوم کو اپنے اندر جذب کرنے اور محفوظ رکھنے کیلئے بے تاب ہیں۔ مجاز کے حوالے سے اس کی مثال دیتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے۔ کہ اگر کوئی کہے کہ "میں ساجد اور عابد کے ساتھ بازار گیا" تو جملہ خود تعین کر رہا ہے کہ ساجد اور عابد معرفہ ہیں اور ان سے مراد خاص افراد ہیں۔ یہ مفہوم مراد لینے سے جملے کا مدعا بالکل واضح ہے۔ لیکن اگر جملے کی ساخت اور اس کے ظاہری مفہوم کو نظر انداز کر کے لغت کی رو سے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو کچھ اس قسم کی صورت حال سامنے آئے گی۔ ساجد سجدہ سے اسم الفاعل ہے اور اس کے معانی خاکساری کرنے والے کے ہیں۔ اس طرح عابد کا مطلب حریص ہوتا ہے۔ لہٰذا جملے کا مطلب ہو گا۔ میں ایک خاکسار اور ایک حریص آدمی کے ساتھ بازار گیا۔

لغت کی رو سے تو یہ مفہوم صحیح ہے۔ لیکن کیا جملے میں یہی بات کہی گئی ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔ لہٰذا کسی جملے یا عبارت کا مفہوم متعین کرتے ہوئے ضروری ہے کہ الفاظ کا حقیقی و مجازی استعمال پیش نظر ہو۔ (صفحہ نمبر 49)

اس طویل اقتباس کو ذرا توجہ سے پڑھیں'۔ اور غور کریں۔ کہ جناب ندیم صاحب نے کیا کہا ہے اور کس سند یا شخصیت کے بھروسے پر اتنی ناروا اور غیر معقول بات تحریر کر دی ہے۔ اب غور کیجئے۔

نمبر1 ندیم صاحب کہتے ہیں۔ کہ ساجد اور عابد اسمائے معرفہ ہیں۔ لہٰذا انہیں اسمائے نکرہ کے طور پر نہیں لینا چاہئے۔ یہ بات بالکل صحیح ہے۔ اسم علم کو نکرہ بنانا یا کسی اسم نکرہ کو علم قرار دینا یقیناً ایک ناروا بات ہے۔ اور یہ بات بھی صحیح ہے کہ اسمائے اعلام کا تعین و تشخص بنیادی طور پر لغت سے نہیں بلکہ معرف (معرفہ بنانے والا) اور واضع (اسم کو وضع کرنے والا) کے توسط سے کیا جانا چاہئے۔ البتہ اگر یہ اسماء مشتق ہوں تو ابتدائی طور پر ان میں ان کے اصل فعل یا مصدر کے مفہوم کی جھلک کسی نہ کسی صورت میں ضرور پائی جاتی ہے۔ یا کم از کم اس کی تمنا ضرور ہوتی ہے اگرچہ وہ بالفعل موجود نہ بھی ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس مثال کو بیان کر کے جناب ندیم' پرویزؒ صاحب کے بارے میں کیا کہنا چاہتے ہیں۔ کیا وہ اس امر کو ثابت کر سکتے ہیں کہ پورے قرآن میں کسی ایک اسم علم کو پرویزؒ صاحب نے اسم نکرہ بنا دیا ہو یا کسی بھی اسم نکرہ کو اسم علم ٹھہرا دیا ہو۔ جہاں تک ہم نے پرویزؒ صاحب کو سنا اور پڑھا ہے۔ ہمیں تو ایسی کوئی ایک مثال بھی نہیں ملی۔ اگر ندیم صاحب کو پرویزؒ صاحب کے ہاں کوئی ایک بھی ایسی بے ہودہ و لایعنی مثال ملی ہو تو وہ ہمارے سامنے پیش کریں۔ تاکہ اس پر غور و خوض کر کے ہم بات کو آگے بڑھا سکیں۔

نمبر2۔ یہ نکتہ بھی غور طلب ہے کہ جب کوئی باپ اپنے بیٹے کا نام عابد یا ساجد رکھتا ہے تو کیا اس کی یہ تمنا نہیں ہوتی کہ اس کا یہ بیٹا' احکام الہیہ کی اطاعت کرنے والا (ساجد) اور ان کی محکومیت اختیار کرنے والا (عابد) ہو۔ لہٰذا ہر وہ لفظ کہ جو کسی مادہ سے نکلا ہو خواہ اسے علم بھی بنا لیا جائے تو اس صورت میں بھی لغوی مفہوم اور ابتدائی معنی کسی نہ کسی شکل میں ضرور موجود رہتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ لغات سے مفاہیم کے اخذ کرنے میں کوئی مدد نہیں مل سکتی اور ہر حوالے سے کسی نہ کسی شارح کی شرح کے ہم محتاج ہیں یہ دعویٰ محل نظر ہے۔ قرآن حکیم عربی زبان میں نازل کیا گیا۔ تاکہ ہم عقل و فکر سے کام لے سکیں۔ دیکھئے (12/2) - (43/2) فلہٰذا عربی زبان اور قرآن فہمی ان کے مابین ایک منطقی تلازم ہے جس سے کسی قیمت پر صرف نظر نہیں کرنا چاہئے۔

نمبر3۔ دیکھئے جناب ندیم صاحب لکھتے ہیں کہ ساجد کا معنی ہے خاکساری کرنے والا اور عابد کا معنی ہے حریص اور لالچی اور ارشاد ہوا ہے کہ لغت کی رو سے تو یہ مفہوم صحیح ہے۔ نامعلوم کہ جناب ندیم صاحب

کے پاس کونسا اردو لغات ہے کہ جس میں عابد کے معنی حریص و لالچی انسان لکھا ہے۔ اگر ایسا کوئی لغات ہے تو وہ اس کا حوالہ دے کر اور اس کے پبلشر کا اتہ پتہ بتا کر ہمارے لئے جود و کرم کا باب وا کرنے میں بخل و تساہل سے کام نہیں لیں گے۔ ایسا مطالبہ کرنا بالکل بجا اور درست ہے کیونکہ آپ نے محولہ بالا عبارت میں اعتراف کیا ہے کہ لغت کے لحاظ سے تو یہ صحیح مفہوم ہے۔ جب لغات کے حوالے سے یہ صحیح ہے تو پھر لغت ہی سے سند کا مطالبہ کرنا بھی یقیناً صحیح اور معقول ہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی لفظ کے عرفی و حقیقی یا مجازی معانی لینے کے بھی کچھ اصول اور ضابطے ہیں۔ یہ نہیں کہ کسی کا جو دل چاہے اور جب اور جیسا چاہے وہ مجاز کا بہانہ بنا کر اصل مفہوم و مدلول الفاظ کا تیا پانچا کر دے۔ لغات سے سند طلب کرنے کے علاوہ ہمارا دوسرا مطالبہ ان سے یہ ہے کہ وہ جناب پرویزؒ کے مضامین و مقالات اور معارف و مطالب کے ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے ان جواہر پاروں میں سے کہ جنہیں اردو میں ادبِ عالیہ کا مقام حاصل ہو چکا ہے' کوئی ایک لفظ ایسا دکھا دیں کہ جس کے ساتھ جناب پرویزؒ نے وہی کچھ کیا ہو جو انہوں نے عابد کے لفظ کے ساتھ کیا ہے۔

آپ نے لکھا ہے کہ کسی جملے یا عبارت کا مفہوم متعین کرتے ہوئے ضروری ہے کہ الفاظ کا حقیقی و مجازی استعمال پیش نظر ہو۔ آپ نے بالکل بجا کہا کہ الفاظ کے حقیقی و مجازی استعمالات پر نظر رہنی چاہئے۔ کیونکہ اگر اسے نظر انداز کر دیا جائے تو اس سے معانی میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ اور ہمارے اردو زبان کے قدیم اور جدید مترجمین قرآن نے عام طور پر اس اصول کا التزام نہیں کیا جس سے ترجمہ قرآن کے دوران بہت سی معنوی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ لیکن بحمداللہ پرویزؒ صاحب کا دامن اس سے پاک ہے۔ ہمارا علی وجہ البصیرت دعویٰ ہے کہ انہوں نے الفاظ کے حقیقی و مجازی معانی کا ہمیشہ خیال رکھا ہے۔ ان کے درس کو سننے والے حضرات کے ذہنوں میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ لیکن ان سے استشہاد کرنا صحیح نہ ہو گا۔ لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مطبوعہ جواہر پاروں سے چند ایک عبارات کا حوالہ یہاں دے دیا جائے۔ تاکہ یہ چیز آپ کے لئے ثبوت و شہادت کا کام دے اور ہمارے لئے زیادتیٔ ایمان و معرفت کا باعث ٹھہرے۔

1- جناب پرویزؒ مفہوم القرآن میں انتیسویں پارے کے آغاز میں ایک ضروری وضاحت کے عنوان کے تحت ارشاد فرماتے ہیں:

> "مفہوم القرآن میں ان الفاظ کے مجازی معانی لئے گئے ہیں۔ اور انہی کی روشنی میں متعلقہ آیات کے مطالب بیان کئے گئے ہیں۔ اگر کوئی صاحب ان الفاظ کے لغوی معانی لینا چاہیں تو وہ قرآن مجید کا کوئی سا مروجہ ترجمہ سامنے رکھ لیں یا میری لغات القرآن دیکھ لیں جس میں الفاظ

قرآن کے لغوی و مجازی دونوں معانی دیئے ہیں (مفہوم القرآن جلد نمبر3 صفحہ نمبر1336)
اس حوالے سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ جناب پرویزؒ نے الفاظ کے لغوی و مجازی معانی اور استعمالات کا التزام کیا ہے۔ لہٰذا ان پر یہ پھبتی کسی طرح فٹ نہیں کی جا سکتی کہ انہوں نے گویا اس اصولِ زبان کا انکار کر کے معانئ قرآن کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔

اب آیئے لغات القرآن کی جانب کہ جس میں آپ نے قدم قدم پر اس امر کا خیال رکھا ہے کہ کوئی لفظ کہاں لغوی و حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے اور کہاں مجازی معنی کے لئے۔ چند ایک حوالہ جات پیش خدمت ہیں:

I- مادۂ حیات کے ضمن میں آپ فرماتے ہیں "بلکہ ان الفاظ کے معانی بہت وسیع ہیں۔ اسی طرح عربی زبان (اور قرآن کریم میں) میں بھی یہ الفاظ بہت وسیع المعانی ہیں۔ اس لئے ہر مقام پر نفس مضمون کے اعتبار سے یہ دیکھنا چاہئے کہ وہاں کونسے معانی زیادہ موزوں ہیں۔ (لغات القرآن صفحہ نمبر572)

II- اسی طرح ع ص ی کے مادے کے ضمن میں ارشاد فرماتے ہیں:
عصائے موسیٰ کا ذکر قرآن کریم میں اور بھی متعدد مقامات پر آیا ہے مثلاً (20/18)
اگر اسے حقیقی معنوں پر محمول کیا جائے تو اس سے مراد لاٹھی ہو گی۔ لیکن اگر اسے مجازی معنی میں لیا جائے تو اس سے مفہوم وہ ضابطۂ خداوندی ہو گا (وحی کا پیغام) جو آپ کی زندگی کا سہارا اور قوم کیلئے وجۂ تقویت تھا۔ اور جس کے سامنے ساحرینِ فرعون کی باطل تعلیم کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھی۔ اس اعتبار سے قرآنِ کریم کے مختلف مقامات میں سیاق و سباق کے مطابق معانی متعین کئے جا سکتے ہیں۔ (لغات القرآن صفحہ نمبر1170/1169)

مستند حوالہ جات کے بعد اس اعتراض میں کیا وزن رہ جاتا ہے کہ جناب پرویزؒ نے الفاظ کے حقیقی و مجازی معانی میں فرق و امتیاز کو روا نہیں رکھا جس کے نتیجے میں ان کے ہاں الفاظ و معانی کے مابین پایا جانے والا حقیقی رشتہ چُور چُور ہو گیا ہے۔

اب آیئے حقیقت و مجاز کے حوالے سے ہم آپ کے سامنے ایک مثال رکھ دیں اور اس امر کو بھی ظاہر کر دیں کہ کسی لفظ کے لغوی معنی سے مجازی معنی کی طرف کب رجوع کیا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ وہ سبب کہ جو لغوی معنی سے مجازی معنی کی طرف منتقل ہونے کا باعث بنتا ہے اسے قرینہ صارفہ کہتے ہیں۔ آیئے ایک مثال پہ غور کرتے ہیں۔ عرب کہتا ہے "رایت الاسد یرمی السہم۔" جس کا مطلب ہے کہ میں نے شیر دیکھا اس حال میں کہ تیر پھینک رہا تھا۔ اس عبارت میں الاسد یعنی شیر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اسد یعنی شیر کا لغوی معنی وہ جنگلی درندہ ہے جو حیوانوں کو پھاڑتا ہے۔ یہاں پر اسد سے مراد وہ جنگلی شیر نہیں کیونکہ اس کا

حال یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ تیر پھینک رہا تھا۔ پس تیر پھینکنا یا کسی چیز کو نشانے پر لگانا انسان کا کام ہے نہ کہ حیوان لا یعقل کا۔ پس تیر چلانا وہ قرینہ صارفہ ہے جو لغوی معنی کی بجائے مجازی معنی لینے پر ہمیں مجبور کرتا ہے اس لئے یہاں پر شیر سے مراد دراصل رجل شجاع یعنی بہادر آدمی ہے۔

(27/18) میں واردہ لفظ نملہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ اس نے خطاب کیا اور خطاب کرنے کے دوران یہ بیان بھی کیا کہ یہ آنے والا شخص سلیمان ہے اور اس کے ساتھ اس کا لشکر جرار بھی ہے' تم اس کے سامنے سے ہٹ جاؤ اور اپنی اپنی رہائش گاہوں میں جم کر بیٹھ جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا اس کے لشکروں سے تصادم ہو جائے جس کے نتیجے میں وہ تمہیں کچل ڈالیں۔ اب یہ کلام اتنا بڑا قرینہ صارفہ ہے کہ جو کسی صاحب شعور انسان کو اسے ایک حیوان لا یعقل یعنی چیونٹی ماننے کیلئے کسی صورت پر آمادہ نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ علامے مصر ہیں کہ ہم اسے چیونٹی ہی مانیں۔ حالانکہ یہ معروف حقیقت ہے کہ ہر ایسی قوم اور ملت میں جو ابھی اقدار وحی سے ہم آہنگ نہ ہوئی ہو اس میں انسانوں کے نام حیوانوں پر رکھے جاتے ہیں حتیٰ کہ یہ رواج آج بھی دول یورپ میں عام ہے۔ آج بھی آپ کو وہاں مسٹر بل (بھینسا) جارج فاکس (لومڑ) مسٹر وولف (بھیڑیا) کے نام سنائی دیتے ہیں۔ اور عربوں کے ہاں نزول قرآن کے وقت بھی بنو کلاب (کتے کے بچے) بنو اسد (شیر کے بچے) جیسے ناموں والے بڑے بڑے قبائل موجود تھے۔ اب ان اسماء کو سن کر کوئی شخص جنگلی کتوں یا بھیڑیوں کی جانب اپنے ذہن کو نہیں لے جاتا۔ لیکن قرآنِ حکیم میں چونکہ جناب ندیم صاحب نے اس نملہ کو صاحبِ اختیار و ارادہ انسان ماننے کی بجائے اسے حیوان لا یعقل یعنی چیونٹی ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے اور اپنی جانب سے اپنی دانست میں بڑے قوی دلائل دیئے ہیں اور اپنی عربی دانی کا اچھا خاصا اظہار کیا ہے' لہٰذا اگلی قسط میں ہم اس پر مفصل بحث کر کے ثابت کریں گے کہ نملہ کے باب میں پرویزؒ صاحب کا موقف کہ وہ ایک انسان تھا صحیح ہے اور ہم اسے دلائل اور قرآنی آیات کی روشنی میں ثابت کریں گے۔ وباللہ التوفیق۔ نملہ کا لفظ سنتے ہی ہمارے ان "علاموں" کا ذہن اسے وہ چیونٹی ماننے اور منوانے کیلئے گھومنے لگتا ہے۔ جو حیوان لا یعقل ہے' لیکن یہ ہر حوالے سے غلط ہے۔ کیونکہ نملہ کا کلام خود متعین طور پر بتا رہا ہے کہ اس کا متکلم کون ہے۔

اس سے قبل کہ سورۃ تکویر اور سورۃ النمل کے بارے میں جو کچھ ندیم صاحب نے تحریر کیا ہے اور اس کے حوالے سے جناب پرویزؒ کا جس طرح تعاقب کرنے کی کوشش کی ہے۔' اس کا جواب دینے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے فہم قرآن کے باب میں خلاصۃ القول کے طور پر جو کچھ کہا ہے' ذرا اس کے بارے میں بھی گفتگو کرتے چلیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔ "آج کے دور میں قرآن مجید کی تفسیر کرتے ہوئے ضروری ہے کہ ان سب باتوں کا خیال رکھا جائے۔ ایک مفسر کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ عرب معاشرے کی

روایات' تاریخ عرب' عربی زبان اور اس کے مختلف اسالیب۔ جاھلی ادب اور رسولؐ اللہ کی سیرت کا گہرا مطالعہ اور ذوق رکھتا ہو' بھی محل نظر ہے۔ اور اسی قرآن مجید کی یہ حقیقت کہ وہ ایک کتاب ہے اور اس کا یہ لفظ سیاق و سباق کے ایک اوپر گہرا مطالعہ اور ذوق رکھتا ہو بھی محل نظر ہے۔ نظم سے بندھا ہوا ہے اس کے پیش نظر ہو"

اس عبارت میں صاحب تحریر نے جو جو نکات بحث کیلئے اٹھائے ہیں'ان پر فردا" فردا" گفتگو کرنا خاصا مشکل اور ایک طول طویل عمل ہے۔ البتہ ایک دو بنیادی نکات پر گفتگو کرنا اگلی بحث کیلئے راستہ ہموار کرنے کے لئے کافی معاون و مددگار ثابت ہو گا۔

1- سب سے پہلے صاحب تحریر نے مفسر قرآن کے لئے کچھ لوازمات کا تعین کیا ہے۔ اور آخر میں جناب پرویزؒ کو اس جرم کا مرتکب قرار دیا ہے کہ انہوں نے ان امور کو اپنے پیش نظر نہیں رکھا۔ اب جہاں تک اس امر کا سوال ہے کہ مفسر قرآن کے لئے کن کن امور کا خیال رکھنا ضروری ہے اور کون کونسے امور اس حوالے سے اس کیلئے وجوب کی حیثیت رکھتے ہیں اور کن امور کی حیثیت امور استحبابیہ کی ہے تو ان امور لازمہ و غیر لازمہ کے درپے ہونے سے پہلے ایک دوسرے اہم سوال کا جواب دینا لازم ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ آیا کوئی بھی انسان خواہ اس کا مقام و مرتبہ اولین و آخرین میں سب سے بڑھ کر کیوں نہ ہو' کیا اسے مفسر قرآن ہونے کا مقام یا منصب دیا جا سکتا ہے؟ کیونکہ یہ بات تو ہمارے ایمانیات میں جزو لازم کے طور پر داخل ہے کہ قرآن کلام اللہ ہے یا قرآن ایک ایسی تصنیف ہے جس کا مصنف اللہ تعالیٰ خود ہے۔ اب یہ بات بھی بدیہی طور پر مسلم ہے کہ کوئی مفسر یا شارح مصنف کے علم و فضل کے مقام و مرتبہ سے فروتر نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے کم از کم اس کا ہم پلہ ہونا لازم ہے۔ ایسا ناممکن ہے کہ کسی کتاب کا مصنف تو اپنے فن یا اختصاص میں ایم۔ اے یا پی ایچ ڈی کی ڈگریوں کا حامل ہو لیکن اس کی تفسیر و تشریح کرنے والا بی۔ اے فیل ہو یا وہ صرف بی اے یا ایم اے کی کسی ثانوی یا کسی ادنیٰ ترین ڈگری یا شہادت کا حامل ہو۔ پس کسی بھی انسان کو کتاب اللہ کا مفسر بنانا یا ماننا اگر ایک طرف اللہ تعالیٰ کے مقام و مرتبہ کو گرانے کے مترادف ہے۔ تو دوسری طرف ایسا کہنا یا کرنا کسی انسان کو اس کے بشری مقام و مرتبہ سے اٹھا کر اسے الوہیت کے مقام و منصب پر فائز کرنے کی مترادف ہے۔ پھر دیکھئے اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہم قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ کا کلام ماننے کی بجائے انجام کار اسے کسی انسان کا کلام ماننے پر مجبور ہونگے۔ نیز سوچئے ! اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے علاوہ کسی اور کو اپنے کلام کی تفسیر و تشریح کرنے کا حق دے رکھا ہے تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ پورا کا پورا قرآن اسے یکبارگی دے دیا جاتا۔ اور پھر چونکہ اسے اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کا اپنی جانب سے مفسر بنا رکھا تھا' لہٰذا بعد میں وہ یکسوئی کے ساتھ اس کی تفسیر و تشریح کرتا رہتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس موقف کے حامل افراد

نے نہ تو اللہ تعالیٰ کی جلالتِ شان کا صحیح اندازہ لگایا ہے اور نہ ہی انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ابدی و سرمدی کلام یعنی قرآن پاک ہی کو اس کا قرار واقعی مقام دیا ہے۔ حتیٰ کہ انہوں نے انبیاء کرام کو بھی ان کے مقام و مرتبہ سے اٹھا کر الوہیت کے مقام و مرتبہ پر فائز کر دیا ہے۔ پس یہ حقیقت آفتابِ عالمتاب سے بھی بڑھ کر روشن و تابناک ہے کہ قرآن پاک بوجہ کلام اللہ ہونے کے کسی انسانی تفسیر و تشریح کا قطعاً" محتاج نہیں ہے۔ لیکن اس حقیقت پر صرف وہی ایمان لائیں گے جو کہ الوہیت و بشریت کے امتیازی اوصاف و لوازم کی از روئے کتاب اللہ معرفت حاصل کر چکے ہیں۔ باقی رہے متفسرین کلام اللہ اور وہ نا قصین عہد کہ جنہوں نے اپنے ایمان و عقیدہ کو شرک سے آلود کر لیا ہے اور اس شرک کی آلودگی کی وجہ سے ظلم اور اس کے خصائص و لوازم کا ان پر قبضہ ہو گیا ہے' تو ان کیلئے اس حقیقت پر ایمان لانا خاصہ مشکل معاملہ ہے۔

اب جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ کتاب اللہ کی تفسیر و تشریح کے حوالے سے ہم نے جس عقلی ضابطے کا اوپر ذکر کیا ہے' تو کیا اس کی تصدیق و تائید کتاب اللہ سے بھی ہوتی ہے یا یہ مجرد ہمارا ہی مسلمہ یا مفروضہ ہے۔ تو اس حوالہ سے عرض ہے کہ یہ مسلمہ ہمارے نزدیک اسی لئے مسلمہ ہے کہ کتاب اللہ کی آیات بینات سے اس کی تصدیق و تصویب ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر وہ اصول یا ضابطہ کہ جس کی تصدیق و تائید کتاب اللہ سے نہ ہوتی ہو ہم اسے اصول یا ضابطہ تسلیم ہی نہیں کرتے۔ اور جس کی تصدیق و تائید کتاب اللہ سے ہو جائے۔ خواہ وہ لوگوں کے نزدیک مفروضہ ہی کیوں نہ ہو تو ہم اسے ثابت شدہ مسلمات اور واجب الاذعان عقائد کے طور پر اپنے قلوب و اذہان میں جگہ دے لیتے ہیں۔

اب آیئے یہ دیکھیں کہ کتاب اللہ کی آیات بینات اس حوالے سے ہماری کیا راہنمائی کرتی ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وقال الذین کفروا لولا نزل علیه القران جملۃ واحدہ ۃ کذٰلک ج لنثبت به فوادک ورتلنه ترتیلا ○ ولا یا تونک بمثل الا جئنٰک باالحق و احسن تفسیرا (25:32-33)

اور اہلِ کفر کا کہنا ہے کہ یہ قرآن اس پر یکبارگی کیوں نازل نہیں کر دیا گیا۔ یہ اس طرح اس لئے ہوا کہ ہم آپ کے دل و دماغ کو اس کے ذریعہ ثبات و استحکام عطا کریں۔ اور ہم اس کی جمع و ترتیب اس طرح کر دیں کہ جس طرح اس کی جمع و ترتیب کرنے کا حق ہے۔ (اور اسی طرح اس لئے بھی ہوا کہ) کہ وہ آپ کے پاس جو اعتراض لائیں۔ ہم ضرور اس کا حقانی جواب آپ کے پاس لے آئیں (اور اس طرح اس لئے بھی ہوا) کہ ہم اس کی احسن تفسیر بھی کر دیں۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے اپنے کلامِ محکم نظام میں جن جن حقائق و معارف کی جانب اشارات کئے ہیں۔ ان کی طرف توجہ دلانے کے حوالے سے ہماری جو ابتدائی ذمہ داری ہے۔ ہم اس سے عہدہ برآ ہو چکے

ہیں۔ ہم طلبائے قرآن کا فریضہ ہے کہ ہم اس مقام پر خود تدبر کریں۔ اب اس مقام سے یہ بات تو روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ قرآنِ مجید میں نہ صرف اللہ تعالیٰ کے آخری کامل و مکمل کلام کا متن ہی محفوظ ہے' بلکہ اس کے اندر الٰہی بیان کی رو سے اس کی احسن تفسیر (سب تفسیروں سے بڑھکر حسن و جمال والی تفسیر) بھی موجود ہے۔ لہٰذا جب قرآنِ حکیم میں اس کا متن اور اس کی احسن تفسیر دونوں ہی محفوظ اور موجود فی الفرقان ہیں تو اب زمانہ جاہلیت کی جاہلی روایات کی خاک چھاننے کا جسے شوق ہو ان کی خاک چھانتا پھرے' مومنین قرآن تو اس طرح کی خاک چھاننے اور خارہ شگافی کرنے کی مشقتوں سے تو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بالکل بچا لئے گئے ہیں (وللہ الحمد علی ذلک)

مزید برآں یہ کہ اس امر پر اس حوالے سے غور کیجئے کہ یہاں پر صاحب تحریر نے جن اصولوں کو قرآن فہمی کے لازمی اصولوں کے طور پر منوانے کی کوشش کی ہے اور ان کا التزام نہ کرنے کا جناب پرویزؒ کو مجرم گردانا ہے' سوال یہ ہے کہ انہوں نے عربِ مبین کے ماسوا جن جاہلی روایات و آثار اور دواوین و امثال کو شرطِ لازم کے طور پر بیان کیا ہے' ان کے حوالے سے سوال یہ ہے' کہ ان کے شرط لازم ہونے کی ان کے پاس قرآنی دلیل کیا ہے۔ نیز اگر یہ چیزیں فہم کتاب اللہ کیلئے شرط لازم اور تفسیر قرآن کیلئے ناگزیر لوازم کے طور پر ہیں تو ان کے محمدؐ رسول اللہ سے لیکر متاخرین تک سند متواتر کے طور پر منقول و متوارث ہونے کی ان کے پاس کیا سند یا شہادت ہے۔ حتمی و یقینی کلام کو ظنی روایات کا پابند بنانا کیا ناقابلِ معافی گناہ یا جرم نہیں ہے؟

اب آیئے اس امر کی جانب کہ جناب پرویزؒ نے چونکہ ان اصولوں کا التزام نہیں کیا لہٰذا ان سے فہم قرآن میں بے پناہ چوک ہی نہیں ہوئی بلکہ وہ اپنے وقت کی سب سے بڑی گمراہی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اپنے اس بلند بانگ دعویٰ کو ثابت کرنے کیلئے صاحب تحریر نے جو قرآنی مثالیں اپنے اس مقالہ میں پیش کی ہیں وہ دو ہیں۔ ایک تو انہوں نے سیدنا سلیمانؑ کے حوالہ سے سورۃ النمل کا واقعہ نقل کیا ہے۔ اور اس میں بالخصوص جنات اور وادی النمل کا جو حوالہ دیا ہے اسے بنیاد بنا کر انہوں نے جناب پرویزؒ کی ذات اور ان کے فہم قرآن کو مورد الزام ٹھہرایا ہے۔ صاحب موصوف کا دعویٰ ہے کہ اس مقام پر الجن سے مراد وہ غیر مرئی مخلوق ہے جو ناری ہے۔ اور جو الانس سے' بقول ان کے' لازماً الگ نوعیت کی مخلوق ہے۔ وہ ناری الخلقت غیر مرئی مخلوق چونکہ جناب سیدنا سلیمانؑ کے لشکروں میں شامل تھی اور جناب پرویزؒ نے اسے پہاڑی دیو ہیکل وحشی قبائل قرار دے دیا ہے' لہٰذا پرویزؒ صاحب نے ایسا کر کے' بقول ان کے اپنے آپ کو بہت بڑی ضلالت میں مبتلا کر لیا ہے۔ پھر اس کے بعد انہوں نے وادی النمل اور اس کی ایک نملہ کے کلام کو اپنے اعتراضات کیلئے نشانہ کے طور پر اپنی آنکھوں کے سامنے رکھا ہے۔ وادی النمل کے حوالے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ واقعی حیوانی چیونٹیوں کی وادی تھی۔ اور نملہ سے مراد لازماً ایک چیونٹی ہے۔ اور اس کے کلام کو

بقول ان کے کسی قیمت پر بھی حیوان لا یعقل کے علاوہ کسی صاحب عقل و بصیرت اور صاحب نطق و کلام انسان کا کلام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے بعد آگے چل کر انہوں نے سورۃ تکویر کے حوالے سے ان مفاہیم کو مورد الزام ٹھہرانے کی کوشش کی ہے جنہیں جناب پرویزؒ نے سورۃ تکویر کے ضمن میں بیان کیا ہے۔ چونکہ یہ مباحث اپنی ذات میں الگ الگ نہایت مہتم بالشان مباحث ہیں اور گذشتہ بحث ویسے ہی کافی طولانی ہو چکی' اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان پر تفصیلی گفتگو کو ہم اگلی مجلس کیلئے اٹھا رکھیں۔ لیکن ایسا نہ ہو کہ ہمارا مخاطب یہ محسوس کرنے لگے کہ ہمارے پاس چونکہ ان کے اٹھائے ہوئے نکات کا کوئی جواب نہ تھا اس لئے اس مقام پر بحث کو بند کرنے کیلئے بحث کے طولانی ہونے کا خواہ مخواہ بہانہ بنا لیا گیا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان مباحث پر اگلی اقساط میں گفتگو کرنے سے قبل کچھ باتیں تمہیدی اصولوں کے طور پر یہاں بیان کر دی جائیں۔ جو آگے چل کر اسی بحث کے لئے محور و مدار کا بھی کام دیں گی۔ اور ساتھ ہی ساتھ ان کی موجودگی میں کوئی دوست یہ بھی نہ کہہ سکے گا کہ ہم نے بحث سے راہ فرار اختیار کر لی ہے۔ لہٰذا اس حوالے سے چند ایک گذارشات اپنے سامعین کے گوش گذار کرنا ہمارے لئے انتہائی طور پر مفید رہے گا۔

سوال یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام محکم نظام میں انبیاءِ سابقین کے ان احوال و کوائف کو کس مقصد کیلئے بیان کیا ہے۔ یعنی ان کے مذکور فی القرآن ہونے کی کوئی علت و غایت ہے؟ یا نہیں؟ اگر کوئی علت و غایت ہے تو وہ نبیؐ اکرم کے حوالے سے کیا ہے۔ اور اہل ایمان کے حوالے سے کیا؟ یہ بات کہنا کہ ان احوال و کوائف کو بیان کرنے کی کوئی علت یا غایت کوئی فلسفہ یا حکمت نہیں ہے' یہ امرُ اللہ تعالیٰ کی جلالت شان اور تقدس ذات کے بالکل منافی ہے۔ کوئی شخص جس میں ادنیٰ ترین ایمانی بصیرت پائی جاتی ہو' وہ اس موقف کو قبول کرنے کیلئے کسی قیمت پر بھی تیار نہیں ہو گا۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ اس الٰہی حکمت کو ہم جاننے کی کیوں نہ کوشش کریں' جو ان احوال و کوائف کے بیان میں پس منظر کے طور پر موجود و مذکور فی القرآن ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس اساسی حکمت قرآنیہ کو نظر انداز کر دینے یا اس کے قلوب و اذہان سے اوجھل ہونے کی وجہ سے کتاب اللہ کا ایک بہت بڑا گرانقدر حصہ ہمارے لئے اسرائیلی روایات کے زیر اثر بھوت پریوں کے قصے کے مماثل قرار پا چکا ہے۔ اس حقانی والٰہی حکمت و حقیقت سے ہمارے ہاں اغماض ہی نہیں برتا گیا بلکہ اس کی سمتِ مخالف میں ہمارے قلوب و اذہان کو بڑی بے دردی کے ساتھ ہانکا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہمارے ہاں مذہبی لٹریچر میں انبیاءؑ و رسلؑ کے حوالے سے قصص النبین کے نام پر مرتب ہونے والے مئولفات میں ایسا مواد در آیا ہے کہ جس سے سلمان رشدی' تسلیمہ نسرین اور رنگیلا رسول کے مصنف راجپال جیسے فتنہ و فساد پرور اشخاص استفادہ کر کے عالم اسلامی کے فکری و نظریاتی امن و امان کے بھس میں

فتنہ و فساد کی چنگاریاں پھینک کر اسے بھک سے اڑاتے رہتے ہیں۔ اور آج بھی اڑا رہے ہے۔ لیکن اگر وہ الٰہی حکمت و غایت کو کہ جسے اللہ تعالیٰ اپنے کلام محکم نظام میں روز روشن کی طرح بیان فرما چکے ہیں' اسے ہم نے اصول محکم کے طور پر اپنے سامنے رکھا ہوتا تو ایک طرف تو ہم اپنے انفرادی واجتماعی دائروں میں پائے جانے والے تضادات و ظلمات سے رستگاری حاصل کرنے کیلئے سابق انبیاءؑ کے احوال و کوائف سے حتمی و یقینی حکمت عملی حاصل کر چکے ہوتے اور دوسری طرف ان انوار و تجلیات کی موجودگی میں اسرائیلی روایات و خرافات کی ظلمت ہمارے نہاں خانۂ دل و دماغ تک تو کجا اس کے ظاہر تک بھی رسائی حاصل نہ کر سکتی۔ پس آیئے یہ دیکھیں کہ سابق انبیاءؑ کے احوال و کوائف کے بیان کے پیچھے وہ کونسی الٰہی حکمت و غایت ہے کہ جس کا تتبع کرنا ہمارے لئے بھی لازم ہے اور جس سے انحراف کرنا ہمارے زوال و ادبار کے لئے مرکزی حیثیت کا حامل ہے۔ اسی حوالے سے قرآن حکیم کی سورۃ ھودؑ میں اللہ رب العزت کا ارشاد اس طرح ہے

وکلا نقص علیک من انبا ء الرسل مانثبت به فوادک و جاء ک فی هذه الحق و موعظة و ذکری للمومنین- (11/120)

"اور یہ سب کچھ جو آپ کے سامنے سابق انبیاءؑ کے حالات و کوائف میں سے بیان کیا جا رہا ہے' تو اس لئے کہ آپ کے دل و دماغ کو اس کے ذریعہ ثبات و استحکام عطا کریں' اور اس (سورت ھودؑ یا ان تمام احوال و کوائف میں) میں بھی الحق آپ کے پاس پہنچ گیا ہے' اس سب کچھ میں اہلِ ایمان کیلئے بھی خالص یاد دہانی اور ان کے شرف و مجد کی ضمانت پائی جاتی ہے"۔

کتاب اللہ کے اس واضح اور دو ٹوک اعلان سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو رہی ہے کہ سابق انبیاءؑ کے احوال و کوائف کے بیان کی غایت نبیٔ اکرمؐ کے دل و دماغ کو ثبات و استحکام عطا کرنا ہے۔ اور ان واقعات کے بیان میں اہلِ ایمان کیلئے بھی خالص یاد دہانی اور ان کے شرف ومجد کے حصول و یافت کی ضمانت پائی جاتی ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ وہ تمام کمالات و خصائص جو سابق انبیاءؑ و مرسلینؑ میں الگ الگ پائے جاتے تھے' وہ تمام کمالات بلکہ کچھ مزید اضافے کے ساتھ خاتم النبین محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس میں یکجا طور پر پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح وہ تمام خوبیاں اور کمالات جو صحفِ سابقہ میں الگ الگ پائے جاتے تھے' وہ تمام خوبیاں اور کمالات خاتم الصحف قرآنِ پاک میں بدرجۂ اُتم یکجا طور پر پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح وہ کمالات و برکات جو سابقہ امتوں میں الگ الگ پائے جاتے تھے وہ بھی بدرجۂ اُتم اس خاتم الاممؐ امتِ مسلمہ' امت محمدیہؐ میں پائے جاتے ہیں۔

پس ہمارا سوال یہ ہے کہ اگر سیدنا سلیمانؑ کیلئے غیر مرئی' عالم الغیب' ناری الخلقت' ہر آن متغیر' مافوق

العلوت قوتوں اور طاقتوں کے مالک جنّات کو مسخر کر دیا گیا تھا اور ایسے جنّات چند ایک نہیں بلکہ ان کے لشکر تھے' جو کہ سیدنا سلیمانؑ کے ماتحت کر دیئے گئے اور وہ ان مسخر شدہ جنّات سے اپنے کارہائے منصبی کی ادائیگی میں مدد وتعاون حاصل کیا کرتے تھے تو ایسے بیانات سے نبی اکرمؐ کے دل و دماغ کو کیسے ثبات واستحکام عطا ہو گا جبکہ ایسا کوئی کمال اور ایسی کوئی موہبتِ خاص ان کو عطا نہیں کی گئی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس صورت میں ایسے بیانات (نعوذ باللہ من ذلک) آپ کیلئے اندوہ و دلگیری کا باعث بنیں گے۔ ایک مثال پر غور کیجئے۔ آپ اپنے ملازم سے کہتے ہیں۔ ہمارا ایک ایسا اور ایسا ملازم ہوا کرتا تھا۔ اس نے ایسی ایسی اور اتنی بڑی بڑی خدمات انجام دی تھیں۔ ہم نے اس کی ان خدمات سے خوش ہو کر اپنی خشکی و تری کی تمام چیزوں کو اس کے ماتحت کر دیا تھا۔ ہم نے اسے اپنے ہاں کے ماحول پر خاص الخاص تصرف دے رکھا تھا۔ کیا کہنا اس ملازم کا وہ تو نہایت وفا شعار ملازم تھا۔ اب بتایئے ایسے بیانات سے موجودہ ملازم کی حوصلہ شکنی ہو گی یا حوصلہ افزائی۔ حوصلہ افزائی تو اس صورت میں ہو گی کہ اسے بتایا جائے کہ ملازم تو ہمارے پہلے بھی تھے پر وہ تجھ جیسے کہاں تھے۔ ہم نے اپنے ہر ملازم کو نوازا مگر تیرے لئے ہماری نوازشوں کی نظیر کہاں۔ تجھے تو ہم وہ کچھ دے چکے ہیں اور مزید دینے والے ہیں کہ وہ کچھ ہم نے آج تک کسی ملازم کو نہیں دیا۔ اور نہ ہی آئندہ کسی کو اتنا دینے والے ہیں۔ بلا شبہ اس دوسرے بیان میں اس ملازم کی شانِ اختصاص ہی کا بیان نہیں ہے بلکہ اسے عطا ہونے والے انعامات بھی بلا شبہ بے مثال ٹھہرتے ہیں۔ پس اسی طرح ہمارے نزدیک وہ تمام کمالات' عنایات اور نوازشات جو سابق انبیاءؑ پر فرداً" فرداً" ہوئی تھیں' وہ خاتم النبین محمدؐ رسول اللہ پر یکجا طور پر ہوئی ہیں۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو ایسے بیانات میں آپ کیلئے اندوہ و دل گیری کے سوا کچھ نہیں ہے۔

پس خلاصہ کلام یہ کہ ہمارے یہ کرم فرما ذرا فکر و تدبر سے کام لیں۔ کیونکہ تدبر قرآن کسی' تفسیر تدبر' کو پڑھ لینے سے حاصل نہیں ہوتا' بلکہ اس کیلئے تو ہر فرد کو ایمان و ایقان سے آراستہ ہو کر براہِ راست آیاتِ الٰہی کے متن اور اس کے الفاظ کے منشاء و تصور کو پانے کے لئے مصروف تگ و تاز ہونا پڑتا ہے۔ پس سوچنے کی یہ بات ہے کہ ان غیر مرئی ناری الخلقت جنّات کے سیدنا سلیمانؑ کے لئے مسخر کر دیئے جانے کے بیان میں خاتم النبین محمدؐ رسول اللہ اور آپؐ کے متبع اہلِ ایمان کے لئے' ان کی حوصلہ افزائی اور ان کے قلوب و اذہان کے ثبات و استحکام کا کونسا سازو سامان پایا جاتا ہے۔ پھر یہ کہنا' جیسا کہ ہمارے اس مقالہ نگار نے اپنے اس مقالہ میں بیان کیا ہے' کہ سیدنا سلیمانؑ کو ایسی عظیم الشان سلطنت دی گئی تھی جس کی نظیر تاریخ انسانی میں کہیں دکھائی نہیں دیتی (صفحہ نمبر 51) حقیقت یہی ہے کہ زمانہ جاہلیت کے جاہلی شعراء کے قصوں اور کہانیوں کو دن رات وِردِ زبان اور حرزِ جان بنائے رکھنے سے یہی قلبی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے۔ اس بندۂ خدا کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ خلافتِ راشدہ کے دور کی سلطنت اور خلافتِ عربیہ کی حدود اور عظمت و جلال'

سلیمانؑ سلطنت سے کہیں بڑھ کر تھی۔ کیونکہ یہ سلطنت دراصل سلطنتِ محمدیہؐ تھی۔ وہ محمدؐ کہ جس کی آمد کیلئے داؤدؑ و سلیمانؑ اور موسیٰؑ و مسیحؑ چشم براہ تھے۔ پس اصل بات یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت کے شعراء کے کلام میں تو غل و اشتعال' قلوب کو ایمانی و عرفانی حوالے سے جس طرح زنگ آلود بناتا ہے' اسے دن رات اوڑھنا بچھونا بنائے رکھنے سے دل و دماغ میں جو حجابات پیدا ہوتے ہیں' یہ مضمون اس کی بہترین مثال ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ سلیمانؑ کمالات سب کے سب بمعہ شی زائد کے' ہمارے محبوب و متبوع خاتم النبین محمدؐ رسول اللہ کو ہی عطا نہیں کئے گئے تھے بلکہ آپ کی اتباع کرنے والے 'خدّام قرآن کو بھی ہر ہر دور میں ان کے عطا کئے جانے کا مژدہ و خوشخبری سنائی گئی ہے۔ اے کاش کہ ان دوستوں نے ذرا تدبر سے کام لیا ہوتا تو ان کے لئے ان جنّات کی حقیقت کو جان لینا کچھ مشکل نہ تھا۔

سوچئے ! قرآنِ حکیم' سیدنا سلیمانؑ کے لئے جنّات کے لشکروں کا ذکر کرتا ہے تو وہ غیر مرئی اور محیّر العقول اور فوق العادت قوتوں اور طاقتوں کے حامل جنّات جو ہمارے ان دوستوں کے قلوب و اذہان پر مستولی ہیں۔ غور کیجئے ! ان کا مصداق یہ سلیمانیؑ جنات کیسے ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ ایسا تو ایک جن ہی ان کے لئے ہر حوالے سے کافی تھا۔ ایسے تو ایک ہی جن سے پوری دنیا کو فتح اور مسخر کیا جا سکتا تھا اور جب اس کے لئے ایک ہی جن کافی ہے تو ایسے جنّات کے لشکروں کی کہاں سمائی ہو گی۔ پھر غور کیجئے قرآن ڈنکے کی چوٹ اس امر کا اعلان جنّات کی زبان سے کراتا ہے کہ وہ عالم الغیب نہ تھے دیکھئے۔ (34:14)

یہی باغات اور ان کے پھل پھول اور فواکہ و ثمرات ان کے لئے نعماء ہیں 55/11-13

بادبانی کشتیاں اور بحری جہاز ان کے لئے نعماء ہیں۔ 55/24

رسولِ بشر اور اس کی کتاب پر وہ ایمان لائے ہیں۔ 24/29

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر ایمان لانے سے پہلے وہ کتابِ موسیٰؑ پر ایمان رکھتے تھے۔ 46/29-30

لیکن اس سب کچھ کے باوجود وہ تھے ناری الخلقت؟ یا للعجب ! بہرحال مقالہ کافی طویل ہو گیا ہے۔ اس لئے اگلی اقساط میں ہم سیدنا سلیمانؑ اور ان کے جنّات۔ وادی النمل اور ان کی نملۃ اور سورۃ تکویر اور اس کے مشمولات کے حوالے سے محترم مقالہ نگار کے اٹھائے ہوئے نکات کا جواب دیں گے' اور ثابت کریں گے کہ محترم مقالہ نگار جس روایتی و اسرائیلی تفسیری مکتبِ فکر کے مؤید و ترجمان ہیں اس کے مقابلے میں جناب علامہ پرویزؒ کا قرآن فہمی کا نقطۂ نظر علم و حکمت' نور و بصیرت اور ایمان و یقین کے حوالے سے نہ صرف بدرجہا بہتر اور مضبوط ہے بلکہ نوعِ انسانی کے مسائل کا بالعموم اور اُمّتِ مسلمہ کی موجودہ حاضر مشکلات کا حل بالخصوص صرف اور صرف ان کے قرآن حکیم کے متعین کردہ افکار و تصورات کو اپنانے پر ہی منحصر ہے اور بس۔ (جاری ہے) (وباللہ التوفیق)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

روزہ کے احکام

چونکہ رمضان المبارک کا مہینہ قریب آرہا ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ (معمول کے مطابق[1]) قرآن کی رُو سے روزے کے احکام مختصر الفاظ میں بیان کر دیئے جائیں۔ یہ احکام سورہ بقرہ میں آئے ہیں۔ متعلقہ آیات یہ ہیں:

(۱) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ (۲/۱۸۳)

"اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! جس طرح تم سے پچھلی قوموں پر روزہ فرض کیا گیا تھا۔ اسی طرح تم پر بھی روزہ فرض کر دیا گیا ہے تاکہ تم قانونِ خداوندی کی نگہداشت کر سکو۔"

(۲) أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ۚ ——— "یہ روزے چند گنے ہوئے دنوں کے ہیں"

(۳) فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ

"پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے"

(۴) وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ

(۵) اور جو لوگ بدشواری روزہ رکھ سکیں ان کے لئے روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا کافی ہے

(۶) شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ.....

روزے رمضان کے مہینے کے ہیں جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے۔

(۷) فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ (۲/۱۸۳-۱۸۵)

---

[1] - ان احکام کو ہم اس سے پہلے بھی کئی بار درج کر چکے ہیں لیکن ہم ان کے اعادہ کی ضرورت ہر سال سمجھتے ہیں۔ اسلئے انہیں پھر دہرایا جا رہا ہے۔

" لہٰذا تم میں سے جو کوئی اس مہینہ میں اپنے گھر پر موجود ہو تو اسے اس مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں۔ البتہ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو ------ تو وہ دوسرے دنوں سے گنتی پوری کرلے۔"

(۸) وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ (۲/۱۸۷)

اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ تمہارے لئے صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے متمیز ہو جائے پھر رات تک روزہ پورا کرو۔

(۹) اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ (۲/۱۸۷)

اور تمہارے لئے روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں سے اختلاط حلال کیا گیا ہے۔

ان آیات سے معلوم ہو گیا کہ :-

۱ روزے رمضان کے مہینے کے ہیں (تین دن یا نو دن کے نہیں بلکہ پورے مہینے کے)

۲ روزے میں، اس وقت سے لے کر جب صبح کی سفیدی نمودار ہو جائے، دن کے ختم ہونے تک کھانا پینا اور بیوی سے اختلاط منع ہے۔

۳ روزے اس کیلئے ہیں کہ جو اس مہینہ میں اپنے گھر پر موجود ہو اور تندرست ہو۔ مریض تندرست ہونے پر اور مسافر سفر سے واپسی پر دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے۔

۴ اب ایک شکل اور باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ ایک شخص (عام عرفی معنوں میں) نہ تو بیمار ہے اور نہ مسافر ہے۔ لیکن کسی وجہ سے اسے روزے رکھنے دشوار ہیں۔ مثلاً ایک بوڑھا آدمی اپنے گھر پر موجود ہے اور مریض بھی نہیں لیکن بڑھاپے کی وجہ سے کمزور اتنا ہے کہ بمشکل روزہ رکھ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ رمضان کے بعد دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے۔ ایسے لوگوں کا حکم شق نمبر ۴ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ جو لوگ ایسے ہوں کہ بمشکل روزہ رکھ سکتے ہیں انہیں اپنے آپ کو دشواری میں ڈالنے کی ضرورت نہیں وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔

غور فرمائیے! اوپر کی چاروں شقوں میں ہر قسم کے حالات جمع ہو گئے ہیں اور یہی احکام کی جامعیت کا تقاضا تھا۔

ہم نے وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ کا ترجمہ ـــــ وہ لوگ جو بدشواری روزہ رکھ سکیں ـــــ کیا ہے۔ حالانکہ اس کا عام ترجمہ ـــــ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہو ـــــ کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ اس لئے کہ اس ترجمہ کی رُو سے مطلب یہ ہوگا کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں۔ وہ تو ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں اور جن میں روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہ ہو وہ روزے رکھا کریں۔ حالانکہ قرآن کا منشاء

یہ نہیں ہوسکتا۔ بات یہ ہے کہ لفظ "طاقت" کا جو مفہوم ہمارے ہاں اردو میں رائج ہے وہ اس سے مختلف ہے جو عربی زبان میں اس کا مفہوم ہوتا ہے۔ ہمارے مترجمین نے عربی کے لفظ 'طاقت' کا ترجمہ اردو کے لفظ "طاقت" سے کر دیا۔ ان دونوں زبانوں کے مفہوم میں جو فرق تھا اسے نظر انداز کر گئے۔ عربی زبان میں اس لفظ کا کیا مفہوم ہوتا ہے۔ اس کے لیے عربی زبان کی لغات دیکھئے۔ محیط المحیط جلد دوم ص ۱۳۰۴ میں ہے۔

> طاقت کے معنی کسی چیز پر قدرت رکھنا ہیں۔ لیکن یہ قدرت کی ایسی مقدار کو کہتے ہیں کہ جسے انسان بمشقت کر سکتا ہے۔ دراصل یہ لفظ اس طوق سے ماخوذ ہے جو کسی چیز کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے۔ لَا تُحَمِّلْنَا مَالَا طَاقَةَ لَنَا بِہٖ کے معنی یہ نہیں کہ جس کی ہمیں قدرت نہ ہو بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کا بجا لانا ہمیں دشوار ہو۔

اس طرح عربی کی مشہور لغت لسان العرب ص ۱۰۳ جلد ۱۲ میں ہے کہ

> طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جو کسی انسان کے لئے بہ مشقت کرنا ممکن ہو۔

مفتی محمد عبدہٗ اپنی تفسیر المنار ص ۱۵۵ جلد ۲ میں فرماتے ہیں۔

> اَلطَّاقَۃُ دراصل مَکْنَتْ اور قدرت کے بالکل ادنیٰ درجہ کا نام ہے۔ چنانچہ عرب اَطَاقَ الشَّیْئَ صرف اس وقت کہتے ہیں جب اس کی قدرت نہایت ہی ضعیف ہو یعنی بدشواری اسے برداشت کر سکتا ہو۔ چنانچہ یُطِیْقُوْنَہٗ سے مراد بوڑھے، ضعیف اور اپاہج لوگ ہیں جن کے اعذار کے دور ہو جانے کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اور وہ لوگ ہیں جو ان ہی کی طرح معذور ہیں یعنی ایسے کام کاج کرنے والے لوگ جن کی معاش خدا نے پُرمشقت کاموں میں رکھ دی ہے...اسی بنا پر امام راغبؒ نے لکھا ہے کہ طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جس کا کرنا انسان کے لئے بمشقت ممکن ہو۔

اس کی تائید تفسیر کشاف سے بھی ہوتی ہے جس میں لکھا ہے کہ:۔

> طَاقَۃٌ کے مفہوم میں وہ کام آتے ہیں جنہیں بہ تکلیف یا بہ مشقت کیا جا سکے اور وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ سے مراد بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں ہیں۔ جن کے لئے روزہ نہ رکھ کر فدیہ دینے کا حکم ہے چنانچہ اسی بناء پر یہ آیت ثابت ہے منسوخ نہیں ہے۔ (تفسیر کشاف ص ۲۵۵ جلد ۱)

تفسیر روح المعانی میں ہے۔

> عربی زبان میں اَلْوَسَعْ کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو سہولت کے ساتھ ہو اور طَاقَۃٌ کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو شدت اور مشقت کے ساتھ ہو۔ لہٰذا (آیۂ زیرِ نظر) کے

معنی یہ ہوں گے اور ان لوگوں پر جو شدّت اور مشقّت کے ساتھ روزہ رکھ سکتے ہیں ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے ..... (روح المعانی ص۵۹ جلد ۲)

تصریحاتِ بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ عربی زبان میں لفظ "طَاقَۃ" کا مفہوم کیا ہے اور اس بنا پر وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ کا ترجمہ ——— اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں ——— کر دینا کس قدر غلط فہمیوں کا موجب ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس کا ترجمہ ——— اور جو لوگ بدشواری روزہ رکھ سکیں... کیا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ ایک اصول بیان کر دیتا ہے اور اسے امّت کے اجتماعی نظام پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اس کی جزئیات خود متعیّن کر لے۔ چنانچہ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ میں بھی یہی اسلوب اجتماعی اختیار کیا گیا ہے۔ یہاں ایک اصول بیان کر دیا گیا ہے اور اس کی تفصیلات خود بیان نہیں کیں (کہ وہ لوگ کون ہیں جو بہ مشقّت روزہ رکھ سکتے ہیں) اس کی تفاصیل پہلے بھی متعیّن کی جا چکی ہیں اور ان پر اب بھی غور کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ علّامہ قرطبی کی کتاب "جامع احکام القرآن" ص۲۶۸ - ۲۶۹ جلد ۲ میں ہے کہ:

> تمام علماء کا اس پر اتّفاق ہے کہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں جو روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے یا شدید مشقّت کے ساتھ طاقت رکھتے ہیں۔ ان کیلئے روزہ نہ رکھنا جائز ہے مگر اس میں اختلاف ہے کہ ایسے لوگوں کے ذمّے کیا ہے؟ چنانچہ امام ربیعؒ اور امام مالکؒ نے کہا ہے کہ ان کے ذمّے کچھ بھی نہیں ہے۔ البتہ امام مالکؒ نے کہا ہے کہ اگر یہ لوگ روزانہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں تو میرے نزدیک یہ پسندیدہ ہے اور حضرت انسؓ، ابن عباسؓ، قیس بن السّائب اور ابوہریرہؓ نے فرمایا ہے کہ ان لوگوں کے ذمّہ فدیہ ہے۔ امام شافعیؒ اور اصحاب الرّائے (حنیفہ) امام احمد اور امام اسحٰقؒ کا قول بھی یہی ہے۔ نیز ابن عبّاس کی روایت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی اُمّ ولد سے فرمایا جو حاملہ تھی یا بچّہ کو دودھ پلا رہی تھی کہ تو اُن لوگوں میں سے ہے جو بہ مشقّت روزے رکھ سکتے ہیں۔ لہٰذا تیرے ذمّے فدیہ ہے قضا نہیں۔

مفتی سید محمد عبدہٗ نے اور بھی اضافہ فرمایا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

> اَلَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ سے یہاں مراد بوڑھے، ضعیف اور ایسا بیمار لوگ ہیں جن کے اعذار کے دُور ہو جانے کی امید نہیں ہوتی۔ ایسے ہی وہ لوگ بھی ان کے ہمرے میں شمار ہونگے جو مزدور پیشہ ہوں جن کی معاش خدا نے پُر مشقّت کاموں میں رکھ دی ہے۔ مثلاً کانوں سے کوئلہ نکالنے والے

اور وہ مجرم جن سے قید خانوں میں مشقّت کے کام لیئے جاتے ہیں اور جن پر روزہ رکھنا گراں ہو ..... تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں جن پر کسی ایسی وجہ سے جن کے دُور ہو جانے کی کوئی امید نہ ہو۔ روزہ رکھنا گراں گذرتا ہو جیسے بڑھاپا۔ اور پیدائشی کمزوری اور ہمیشہ محنت کے کاموں میں مشغولیت اور پرانی بیماری جس کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو۔ ایسے ہی وہ شخص جس کی مشقّت کا سبب ہوتا رہتا ہے جیسے حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت۔ ان سب لوگوں کیلئے جائز ہے کہ وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلادیں۔ اتنا کھانا جو ایک اوسط درجے کی خوراک کے آدمی کا پیٹ بھر سکے۔ (تفسیر المنار ص ۱۵۵ ص ۱۵۷ جلد ۲)

اِن تفاصیل سے حسب ذیل فہرست مرتّب ہو جاتی ہے:

۱ بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت
۲ حاملہ عورتیں۔
۳ دودھ پلانے والی عورتیں
۴ اپاہج اور معذور لوگ
۵ پرانی بیماریوں والے جن کے اچھا ہونے کی امید نہ رہے اور وہ ان کی وجہ سے روزہ بمشقّت رکھ سکیں
۶ ایسے کمزور لوگ جو خلقی اور پیدائشی طور پر (CONSTITUTIONAILY) کمزور پیدا ہوئے ہوں
۷ وہ مزدوری پیشہ لوگ جن کی معاش ہمیشہ پُرمشقت کاموں میں ہوتی ہے مثلاً کانوں میں کام کرنے والے کارخانوں میں کام کرنے والے یا رکشہ چلانے والے۔
۸ وہ مجرم جن سے جیل میں مشقّت کے کام لئے جاتے ہوں۔

یہ فہرست جامع اور مانع نہیں۔ بحالاتِ موجودہ اپنے اپنے حالات کے مطابق اس میں اضافہ ہو سکتا ہے اصول یہی ہے کہ جو شخص بہ مشقت روزہ رکھ سکے وہ روزہ نہ رکھے۔

یہ ہیں روزوں کے متعلق مختصر الفاظ میں قرآن کے احکام۔ ان آیات کو آپ خود بھی قرآنِ کریم میں دیکھ لیں۔ (یعنی سورۂ بقرہ آیات ۱۸۳ تا ۱۸۸)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایک ملاقات

مہمان : جناب حسن نثار صاحب
انٹرویو : عظمت ناز

جناب حسن نثار صاحب کا نام صحافت کی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ ایک سچے صحافی اور اسلام سے گہرا لگاؤ رکھنے والے انسان ہیں۔ آپ 1951ء میں راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کراچی سے حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج فیصل آباد سے انٹر کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے آنرز کیا اور پھر اکنامکس میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کی۔ آپ نے صحافت کا آغاز ماہنامہ دھنک سے کیا اور ماہنامہ تصویر' احساسات' زنجیر' وعدہ اور روزنامہ مساوات کے ساتھ وابستہ رہے۔ صدر ضیاء الحق مرحوم کے دور میں آزادئ صحافت کے لئے جیل کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ آجکل آپ روزنامہ خبریں میں کام کر رہے ہیں۔

گذشتہ دنوں آپ سے میری ملاقات ہوئی۔ جو کافی علمی اور معلوماتی نوعیت کی تھی۔ ان سے ہونے والی بات چیت مختصراً قارئین کے گوش گزار کرتی ہوں۔

سوال : نفاذ شریعت کے آجکل بہت چرچے ہیں۔ کیا ہمارے ملک میں ایسے حالات ہیں کہ شریعت یہاں نافذ ہو سکے جبکہ ہمارے عوام کی اکثریت کا تعلق مخصوص گروہوں سے ہے اور ہر گروہ کی اپنی اپنی الگ شریعت ہے۔ اگر نفاذ شریعت ہو گی' تو کونسی شریعت نافذ کی جائے گی؟

جواب : قرآن' شریعت اور قانون بنیادی طور پر انسان کی بہتری کے لئے ہیں۔ سچائی اور عدل و انصاف پر مبنی قانون جو اللہ نے ہمیں دیا ہے' وہ تو قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ شریعت اور اس کی روشنی میں بنائے گئے قوانین خود غرض اور مفاد پرست لوگوں کے مختلف کھیل ہیں جو انسانوں کی ایک بڑی اکثریت کو غلام بنانے کی ایک گہری سازش کے تحت وضع کئے گئے ہیں۔ میرے خیال میں کچھ لوگ اگر واقعی اس سلسلے میں سنجیدہ ہیں تو انہیں خالص قرآن کے نفاذ کی بات کرنی چاہئے۔ غور کیجئے ! ہر فرقہ کی اپنی الگ الگ شریعت ہے اور اپنی شریعت کے نفاذ کی بات کرنے والے اپنے اپنے مفادات' اپنی اپنی ذاتوں اور ضرورتوں کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ اس لئے میرے خیال میں یہ

بات قابل بحث ہونی ہی نہیں چاہئے۔ اس ملک میں نفاذ شریعت کی نہیں' نفاذ قرآن کی بات ہونی چاہئے۔

سوال : موجودہ حالات میں ایک باشعور فرد کو کیا کرنا چاہئے۔ کیا اسے مایوس ہو جانا چاہئے یا حالات کو بدلنے کی کوشش کرنی چاہئے؟

جواب : موجودہ حالت گو کہ اطمینان بخش نہیں' لیکن پھر بھی انسان کو مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ میرے خیال میں جب ایک باشعور انسان مایوس ہوتا ہے تو ساری انسانیت مایوس ہوتی ہے۔ کیونکہ باشعور افراد ہی دراصل کسی قوم کا حقیقی سرمایہ ہوتے ہیں جو اس قوم کے لئے زندگی کا باعث بنتے ہیں۔ اس لئے پورے خلوص سے ایسے افراد کو اپنا اپنا کام کرتے رہنا چاہئے' اور بہتری کی امید رکھنی چاہئے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ خزاں کے عروج پہ بہار آتی ہے۔ قرآنی نظام تو آیا ہی نافذ ہونے کے لئے ہے۔ اس وقت بہت سے افراد اس کے لئے کوشاں ہیں۔ جو ایک نہ ایک دن کامیاب ہو ہی جائیں گے۔ آج نہیں تو کل۔ ہم نہیں تو نوع انسان کی آئندہ نسلیں قرآنی نظام کے ثمرات سے بہرہ مند ہونگی۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ بدترین سے بدترین حالات میں بھی کچھ آوازیں ایسی ضرور سنائی دیتی رہی ہیں جو تاریکی میں روشنی کا باعث بنیں۔ وہ قومیں خوش نصیب ہوتی ہیں۔ جن کے پاس باشعور افراد موجود ہوتے ہیں' اور زندہ وہی قومیں رہتی ہیں جو فیصلہ کن مرحلے میں کسی مثبت بات سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ اس لئے میرے خیال میں ایسے افراد کو مایوس ہوئے بغیر اصلاح احوال جیسے عظیم کام کے لئے اپنا کردار ادا کرتے رہنا چاہئے۔

سوال : موجودہ حالات میں آپ کس Institution کو اس قابل سمجھتے ہیں جو ایسے افراد پیدہ کر سکتا ہے' جو Revolution کے لئے راہ ہموار کریں۔

جواب : میرے نزدیک قرآن مجید کتاب عظیم ہی وہ واحد Institution ہے جو ایسے افراد تیار کر سکتا ہے' جو قوم میں نفسیاتی تبدیلی کے ذریعے انقلاب لا سکتے ہیں۔ جس دن چند لوگ بھی قرآنی نظام کو اپنے اندر قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے Quranic Revolution کا چانس اسی دن پیدا ہو جائے گا۔

سوال : پاکستان کی Ideology اور قائداعظمؒ پر لوگ مختلف اعتراضات اٹھا رہے ہیں کہ انہوں نے پاکستان بنا کر غلطی کی' جیسا کہ مولانا فضل الرحمٰن نے بھی کہا ہے۔ آپ اس بات سے کہاں تک متفق ہیں؟

جواب :

اس معاملے میں' میں مولانا فضل الرحمٰن سے کافی حد تک متفق ہوں بلکہ میری ذاتی رائے میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں جغرافیائی حدود کے معاملے میں جذباتی آدمی نہیں ہوں۔ ہم آج تک سوگ منا رہے ہیں۔ کہ پاکستان ٹوٹ گیا۔ بھئی ٹوٹ گیا تو کیا ہوا؟ پاکستان کا وہ حصہ evaporate تو نہیں ہو گیا۔ ایک ملک تھا' دو ہو گئے۔ چار بھی ہو جائیں تو کیا فرق پڑے گا۔ دھرتی سے غائب تو نہیں ہو جائیں گے۔ رہیں گے تو ان میں مسلمان ہی۔ خود پاکستان کو بنے 47 سال ہو گئے ہیں۔ لوگوں کی اکثریت نہیں جانتی کہ یہ بنا کیوں تھا؟ ملک تقسیم ہو جانے کے بعد بھی بھارت اور پاکستان کے عوام کو درپیش مسائل میں کوئی فرق نہیں ہے۔ پاکستان میں اس وقت عوام بدترین سیاسی' معاشی اور معاشرتی حالات کا شکار ہیں۔ اس لئے ملکوں کے سائز کے چھوٹا بڑا ہونے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اصل چیز وہ نظریہ ہے جس پر کسی قوم کے پورے نظام کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ آپ خود دیکھیں اس وقت دنیا میں بڑی تعداد میں States Muslim ہیں مگر اسلام کسی ایک میں بھی نہیں ہے۔ پاکستان بھی انہی جیسا ایک ہے۔ جس بچے کو میرٹ پر جاب نہیں مل رہی۔ جس عورت کی اس معاشرے میں عزت محفوظ نہیں۔ جس غریب کو یہاں روٹی' رہائش جیسی زندگی کی بنیادی ضروریات میسر نہیں۔ انہیں کیا فرق پڑتا ہے کہ ان کے ملک کا نام پاکستان ہے یا کوئی اور۔۔۔ اسکا استحصال کوئی مرلی داس کرے یا چراغ دین اس کے لئے دونوں ایک سے ہیں۔ غریب عوام کو تو کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ان پر حکومت انگریز کر رہا ہے یا غیر انگریز۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ قائداعظمؒ ایک عظیم انسان تھے۔ انہوں نے پاکستان صرف اس لئے حاصل کیا تھا کہ نیک نیتی سے اسے ایک ویلفیئر اسلامک سٹیٹ بنایا جائے۔ اس لئے ہمیں ان پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ وہ بے شک ایک مرد مومن تھے۔

ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ہاں ان دنوں جس کی لاٹھی اسکی بھینس کا طریق رائج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ملک ابتک ویلفیئر اسٹیٹ نہیں بن پایا۔ ادھر بھارت میں بھی یہی کچھ ہے۔ وہاں کا سب سے امیر طبقہ مسلمانوں کا ہے۔ ان کی ساری فلم انڈسٹری اور زندگی کے کئی دوسرے شعبوں میں مسلمان چھائے ہوئے ہیں۔

اپنے ملک کی ضرورت اس لئے ہوتی ہے کہ عوام کو ہر سطح پر تحفظ ملے۔ بات اگر غیر معمولی لوگوں کی ہے تو وہ تو امریکہ جا کر بھی رہ سکتے ہیں۔

بات اگر مذہب کی ہے تو "have" اور "have not" بذات خود دو مذاہب ہیں۔ (میں دین کی بات نہیں کر رہا)۔ بھوکے ایک مذہب کے ہوتے ہیں اور پیٹ بھر کر کھانے والے دوسرے

مذہب کے۔ اسلام ان دونوں کے حقوق و فرائض کا تعین کرتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو عمر فاروقؓ کبھی اپنے گورنرز کو یہ خط نہ لکھتے کہ "تم نے باریک کپڑے نہیں پہننے' چھنا ہوا آٹا نہیں کھانا' اچھی سواری استعمال نہیں کرنی۔ گھر کے باہر دربان نہیں بٹھانے"۔ اس خط کے پیچھے اسلامی طرز سیاست کی باقاعدہ ایک Philosophy ہے۔ سربراہ عوام سے جتنا کٹتے جائیں گے اتنا ہی کسی اور مذہب میں داخل ہوتے جائیں گے۔ ہمارا دین بنیادی طور پر یہی ہے کہ اگر غریب کے پیٹ پر ایک پتھر ہے تو سربراہ مملکت کے پیٹ پر دو پتھر بندھے ہونے چاہئیں۔ اسی لئے مسلم معاشرے میں رہنے والے افراد سے کہا گیا کہ اپنی انفرادی ضرورتوں سے زیادہ جو کچھ ہے "واپس کر دو" دے دو نہیں۔ یہ اصطلاح بھی علامہ غلام احمد پرویزؒ نے ہی ہمیں بتائی ہے۔ یہ خوبصورت نقطہ ہے جو انہوں نے explain کیا۔ دینے اور واپس کرنے میں واضح فرق ہے۔ اگر کچھ دیا جائے تو وہ صدقہ اور خیرات کے معنی میں آتا ہے۔ جبکہ واپس کرنے کا مطلب یہ ہے کہ بنیادی طور پر وہ چیز تھی ہی اس ضرورتمند کی۔ اس لئے بات ملک کی جغرافیائی حدود کی نہیں' بات ملک کے نظریاتی اہداف کی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہاں قرآنی نظام نافذ کیا جائے تاکہ عوام اس نظام کے ثمرات سے فیضیاب ہو کر اپنے ملک کی عظمتوں کے گن گا سکیں۔

سوال : ایک براہ راست سوال کرنے کی اجازت دیجئے۔ علامہ غلام احمد پرویزؒ کے بارے میں آپکی کیا رائے ہے؟

جواب : میں ذاتی طور پر پرویزؒ صاحب کا بہت مداح ہوں۔ پرویز صاحب بہت Progressive آدمی تھے۔ میرے خیال میں وہ ان چند لوگوں میں سے تھے' جنہوں نے اسلام کو اسکی صحیح روح کے حوالے سے سمجھا ہے۔

سوال : آپ ایک خلیفہ اور بادشاہ کو کیسے Distinguish کریں گے؟

جواب : میرے خیال میں لفظ "بادشاہ" پورے کے پورے استحصالی نظام معاشرت کی نمائندگی کرتا ہے۔ بادشاہت یہی ہے کہ کوئی ایک یا چند افراد اللہ کی مخلوق کی ایک بڑی تعداد پر جبراً حکومت کریں اور اپنے ذاتی مفادات کی خاطر ان پر اپنے بنائے ہوئے قوانین نافذ کریں۔

جبکہ لفظ "خلیفہ" قرآنی طرز کے انسانی معاشرے کی عکاسی کرتا ہے۔ خلیفہ کہتے ہی اسے ہیں جو زمین پر اللہ کے قانون کی حکمرانی کو عملاً نافذ کرے۔ خلیفہ اور بادشاہ میں تضاد ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

سوال : آپ کے نزدیک انقلاب کا کیا ممکن Procedure ہے۔ ہمارے ہاں انقلاب اوپر سے نیچے

آئے گا یا نیچے سے اوپر کو؟

جواب : میں سب سے پہلے انقلابِ محمدؐ کا ذکر کرونگا۔ محمدؐ جیسا فرد تاریخ میں ایک ہی پیدا ہوا ہے۔ ان کے لائے ہوئے انقلاب نے تاریخ کے دھارے کا رخ بدل دیا' جس کے نتیجہ میں دنیا میں وسیع پیمانے پر جغرافیائی' نظریاتی' سیاسی' معاشی اور معاشرتی تبدیلیاں ظہور پذیر ہوئی۔ میرے نزدیک کائنات کا سب سے بڑا انقلاب مکہ سے شروع ہوا اور یہ واحد انقلاب تھا جسکا مقصد عالم انسانیت کی فوز و فلاح کے سوا کچھ نہ تھا۔

پھر کہنے کو کیمونزم نے بھی ایک انقلاب برپا کیا جس میں صدیوں بعد حکمران طبقے کی جگہ نچلے طبقے نے سنبھال لی اور کچھ ہی دیر بعد یہ غریب طبقہ از خود حاکم بن گیا اور اسطرح جو ظالم تھے' وہ مظلوم بن گئے اور جو مظلوم تھے وہ ظالم بن گئے۔ اور بس !

آپ امریکہ اور فرانس کے انقلاب کو لے لیں۔ وہ انقلاب بھی صرف یہاں تک تھے کہ عوام اچھا کھائیں اچھا پہنیں' اچھے گھروں میں رہیں اور خوشگوار ماحول میں کام کریں۔ حکمرانی وہاں بھی ایک مخصوص طبقہ ہی کرتا ہے۔

سوال یہ نہیں ہونا چاہئے کہ انقلاب کیسے آئے اور کہاں سے آئے؟۔ سوال یہ ہونا چاہئے کہ طبقات کیسے مٹ سکتے ہیں اور سوسائٹی کیونکر مستحکم ہو سکتی ہے۔ سوسائٹی مستحکم بنانے کے لئے کسان کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ وہ زمین کی زرخیزی بڑھانے کے لئے ہل چلا کر اوپر کی مٹی نیچے اور نیچے کی مٹی اوپر لاتا رہتا ہے۔ اس کی کامیابی کا راز اسمیں ہوتا ہے کہ وہ ایسا کتنی تیزی سے کرتا ہے۔ اور وہ ہمیشہ فصلیں بدل بدل کر کاشت کرتا ہے تاکہ زمین کی توانائی بدستور قائم رہے۔

میرے خیال میں انقلاب کا Procedure کسان کے اس عمل کی طرح ہونا چاہئے۔ یعنی یہ کہ معاشرے میں انقلاب لانے کے لئے ہر طبقہ کو حکومت کرنے کا موقع ملنا چاہئے۔ اور حکمران جماعت کو بدلتے رہنا چاہئے تاکہ سوسائٹی توازن بدوش رہے۔

سوال : یہ بات تو طے شدہ ہے کہ نہ تو موجودہ Democracy ہمارے مسائل حل کر سکی ہے نہ مارشل لاء سے حالات بہتر ہوئے ہیں۔ آپکے خیال میں تیسرا کونسا نظام ہے۔ جو ہمارے عوام کو بہتر زندگی کا موقع فراہم کر سکتا ہے۔

جواب : اس وقت پورے عالم میں "اسلام" ہی ایک ایسا ضابطہ ہے جو نوعِ انسان کے ہر قسم کے مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔ ہمیں اس وقت اسلام کی روح کو سمجھ کر اللہ کے دیئے ہوئے نظام کو اپنے ہاں نافذ کرنا چاہئے' تاکہ صدیوں سے ظلم کی چکی میں پسنے والے عوام عدل و انصاف اور

مساوات و اخوت پر مبنی پرامن معاشرے میں سکھ کا سانس لے سکیں۔

سوال : آپ نوجوان نسل کو کوئی تعمیری نوعیت کا پیغام دینا پسند فرمائیں گے۔

جواب : Youth کو میں ہمیشہ ایک ہی بات کہتا ہوں۔ کہ آپ لوگ مایوس ہوئے بغیر اپنی صلاحیتوں کی صحیح نشوونما کریں۔ اور اپنے علم، عقل اور زور بازو سے حالات بدلنے کی کوشش کریں۔

طلوع اسلام : ہمیں محترم نثار صاحب کے جوابات پڑھ کر حیرت ہوئی کہ جہاں ان کے باقی جوابات سے ان کے کھلے ذہن اور خیالات کی پختگی جھلک رہی ہے وہاں پاکستان کی جغرافیائی حدود کے متعلق ان کے خیالات ان کے بقیہ انٹرویو سے میل نہیں کھاتے۔ جس نظام کے قیام کی انہوں نے اتنے خوبصورت انداز میں بات کی ہے، وہ ہوا میں تو قائم نہیں ہو سکتا۔ اس نظام کے قیام کے لئے سرزمین پاکستان کے حصول کی جنگ لڑی گئی اور یہی اسکا مقصد تھا، لیکن وائے قسمت کہ "منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے"۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ان کا یہ احساس ان کے اسی ذہنی اضطراب کی وجہ سے ہے جس کا ذکر انہوں نے اپنے جوابات میں کیا ہے۔ اے کاش! پاکستان کے متعلق حکیم الامت علامہ اقبالؒ اور قائداعظم محمد علی جناحؒ کا خواب شرمندہ تعبیر ہو جائے اور یہ سرزمین اپنے پیدا کرنے والے کے نور سے جگمگا اٹھے۔

علامہ اقبالؒ کی ادبی محفل کا ایک ادبی لطیفہ

1937ء کی ایک شام کو جناب پروفیسر عبدالمجید سالک صاحب (اسلامیہ کالج)، جناب مولانا چراغ حسن حسرت صاحب اور جناب احمد ندیم قاسمی صاحب، علامہ اقبالؒ کو ملنے گئے۔ تعارف کے بعد، علامہ، جناب سالک صاحب سے باتیں کرنے لگ گئے جسے مولانا حسرت اور قاسمی صاحب خاموشی سے سنتے رہے۔ دوران گفتگو علامہ صاحب حسب عادت حقہ بھی پیتے رہے۔ مولانا حسرت بھی حقہ پیتے تھے لیکن علامہ اقبالؒ گفتگو میں ایسے مگن ہوئے کہ انہوں نے حقے کی نے مولانا کی طرف نہ موڑی۔ کچھ دیر بعد علامہ نے مولانا حسرت کی طرف دیکھا اور فرمایا مولانا! بڑے خاموش بیٹھے ہیں! مولانا حسرت نے بڑے ادب سے جواب دیا "جناب، میں آپ کے حقے کی خودی پر غور کر رہا تھا!"

یہ "لطیفہ" میں نے جناب احمد ندیم قاسمی صاحب کی زبانی ریڈیو پاکستان، لاہور کے ایک پروگرام میں یکم نومبر 1980ء کو سنا تھا جسے میں نے اپنی "سکریپ بک" (SCRAP-BOOK) میں محفوظ کر لیا۔

اعزاز الدین احمد خاں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(بسلسلۂ) فریضہ رسالت

(محمد عمر دراز)

جنوری 1995ء کے شمارہ طلوع اسلام میں فریضہ رسالت کے عنوان سے برادر عزیز بشیر احمد عابد صاحب کا مضمون گہری نظر سے پڑھا۔ صاحب مضمون نے کمال عمدگی سے اس نہایت اہم موضوع پر قرآن کریم کی روشنی میں سیر حاصل بحث کی ہے اور نہایت ہی دل کش انداز میں فریضہ رسالت کے مضمرات اور اس ضمن میں امت مسلمہ میں ہونے والی کوشش ہائے ناتمام کا احاطہ کرنے کی سعی کی ہے۔ جناب بشیر احمد عابد قرآن کریم کے طالب علم ہیں اور انہیں یہی طریق زیب دیتا ہے کہ اپنی ہر بات کی سند قرآن کریم سے لائیں۔ ان کے اس سے قبل بھی بیشتر مضامین طلوع اسلام کے صفحات کی زینت بن چکے ہیں اور ان کی ہر کاوش قرآنی تعلیمات پر مبنی ہوتی ہے۔ میں انہیں ان کی اس تازہ سعی مشکور پر مبارک باد دیتا ہوں۔

جو عملی پروگرام انہوں نے اس سلسلہ میں تجویز کیا ہے' اس میں قدم اول طور پر انہوں نے پوری تاکید سے کہا ہے کہ

"اس وقت کسی بھی انقلابی جماعت کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ امت کو کھینچ کر سنت رسولؐ کے اصلی ماخذ قرآن کریم تک لے آئے"۔

اور قرآن کریم کو سنت رسولؐ کا اصلی ماخذ قرار دینے کے لئے' قرآن کریم سے ہی حضور نبی اکرمؐ کی لسان مبارک سے ادا کیا گیا' اپنی سنت کا یہ معیار پیش کرتے ہیں کہ:

انما اتبع مایوحی الی من ربی (7/203)

"یقیناً میں صرف اس وحی کا اتباع کرتا ہوں جو مجھے میرے نشوونما دینے والے (رب) کی طرف سے ملتی ہے"۔

سنت اس طریق عمل کو کہتے ہیں جس میں کبھی کوئی تبدیلی واقعہ نہ ہو۔ ملاحظہ فرمائے قرآن کریم کے ارشادات:

(i) **سنته الله فی الذین خلوا من قبل ولن تجد لسنته الله تبدیلا** ○ (33/62)

"اللہ کی سنت (اس کا قانون) شروع سے یہی چلا آرہا ہے اور تم اللہ کی سنت (اس کے قانون) میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے"۔

(ii) **فلن تجد لسنت اللہ تبدیلا ولن تجد لسنت اللہ تحویلا** ○ (35/43)

"اللہ کی سنت (اس کے قانون) میں نہ تو تم کوئی تبدیلی پاؤ گے نہ اس کی سنت میں کوئی فرق آئے گا"۔

(iii) **سنت اللہ التی قد خلت من قبل ولن تجد لسنت اللہ تبدیلا** (48/23)

"اللہ کی سنت (اس کا قانون) شروع سے یہی چلا آرہا ہے اور تم اس کی سنت (اس کے قانون) میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے"۔

قرآن کریم سے ثابت' حضورؐ کی سنت یہی ہے کہ:

(i) **ان اتبع الا مایوحی الی** ____ (10/15, 6/50)

"میں صرف اس کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے"۔

(ii) **قل انما اتبع مایوحی الی من ربی** ____ (7/203)

"کہہ دیجئے کہ یقیناً میں صرف اس وحی کا اتباع کرتا ہوں جو مجھے میرے نشوونما دینے والے (رب) کی طرف سے ملتی ہے"۔

اور حضورؐ کی یہ سنت (کبھی نہ بدلنے والا طریق) اللہ کے اس ارشاد کی تعمیل میں تھا کہ:

واتبع ما یوحی الیک _____ (10/109)

"(اے رسول) آپ اس کا اتباع کرتے رہیں جو آپ کی طرف وحی کیا جاتا ہے"۔

اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ کا یہ انذار بھی آپؐ کے ہمیشہ پیشِ نظر رہتا تھا کہ:

ولو تقول علینا بعض الا قاویل لا خذنا منہ بالیمین ثم لقطعنا منہ الوتین (69/44-46)

"اگر یہ رسول اپنی طرف سے کوئی بات بنا کر اسے ہماری طرف منسوب کرتا تو ہم اسے دائیں ہاتھ (کی محکم گرفت) سے پکڑتے اور پھر اس کی شہ رگ کاٹ ڈالتے"۔

حضورؐ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا وحی کیا جاتا تھا' اس کی شہادت بھی قرآن کریم ہی سے سامنے آتی ہے۔ رسول اللہؐ نے واشگاف الفاظ میں' اللہ کی شہادت کے ساتھ' یہ اقرار کیا کہ:

قل ای شی ء اکبر شھادۃ قل اللہ شھید بینی و بینکم و اوحی الی ھذا القران لا نذرکم بہ ومن بلغ ___ (6/19)

"ان سے کہہ دیجئے کہ کس کی گواہی سب سے بڑی (معتبر) ہو سکتی ہے! کہہ دیجئے کہ میرے اور

تمہارے درمیان خود اللہ گواہ ہے اور یہ گواہی یہ ہے کہ میری طرف "یہ قرآن" وحی کیا جاتا ہے تاکہ میں تمہیں اور تم سے بعد میں آنے والوں کو غلط روش زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کروں"۔

لہٰذا' حضور نبی اکرمؐ پر وحی بھی صرف قرآن ہی کیا گیا' آپؐ نے تمام عمر اسی کا اتباع کیا اور اسی سے تمسک (اعتصام) کا ارشاد آپؐ نے دنیائے انسانیت سے اپنے آخری خطاب "خطبہ حجتہ الوداع" میں ان الفاظ میں پہنچایا:

"میں تم میں ایک چیز چھوڑتا ہوں۔ اگر تم نے اس کو مضبوط پکڑ لیا تو گمراہ نہ ہو گے۔ وہ چیز کیا ہے؟ وہ "کتاب اللہ" ہے۔ (تاریخ اسلام از ڈاکٹر حمید الدین ص (69)

اور اسی کے مطابق اپنے اعمال و امور کو انجام دینے والوں کو اللہ نے وہ ضمانت بہم پہنچائی ہے جس کا ذکر برادر عزیز بشیر احمد عابد نے کیا ہے یعنی:

ولن یجعل اللہ للکافرین علی المومنین سبیلا ___ (4/141)

"اللہ ایسا کبھی نہیں ہونے دے گا کہ کافر' مومنوں پر غالب آجائیں"۔

کیا ہی خوبصورت انداز بیان ہے عزیز موصوف کا' جب وہ اس آیت کے تتبع میں لکھتے ہیں کہ:

"حامل قرآن امت پر خدائے لم یزل کے سوا کوئی دوسرا فرد حکمرانی نہیں کر سکتا اور نہ ہی کوئی دوسری قوم اسے استحصال اور استبداد کا نشانہ بنا سکتی ہے۔ اس امت کا وجود' خود اس بات کی ضمانت ہوتا ہے کہ کوئی انسان' دوسرے انسان کو غلام نہیں بنا سکتا اور نہ ہی کوئی کسی کو اپنی ہوائے نفس کا نشانہ بنا سکتا ہے۔ چہ جائیکہ یہ امت خود دوسروں کی غلام ہو اور ان کی ہوائے نفس کا نشانہ بنی بیٹھی ہو۔ مسلم اقوام' جس سیاسی خلفشار اور معاشی بدحالی کا شکار ہیں' وہ اس حقیقت کا بیّن ثبوت ہے کہ یہ' جادۂ قرآنی سے ہٹ گئی ہیں"۔

اللہ تعالیٰ کی یہ ضمانت "مومنین" کو دی گئی ہے اور مومن کس طرح بنا جاتا ہے' قرآن نے اس کے متعلق کوئی ابہام نہیں چھوڑا۔ ارشاد ربانی ہے کہ:

والذین امنوا وعملوا الصالحات وامنوا بما نزل علی محمد وھوالحق من ربھم کفر عنھم سیأ تھم واصلح بالھم (47/2)

"جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے صلاحیت بخش کام کئے اور اُس پر ایمان لائے جو محمدؐ پر نازل کیا گیا' اور صرف وہی حق ہے تو اللہ ان کی ناہمواریاں دور کر دے گا اور ان کی صلاحیتیں نشوونما پا کر ان کی حالت سنوار دیں گی"۔

یعنی صرف اس وحی پر ایمان لانے سے کوئی انسان بھی مومن بنتا ہے جو محمدؐ پر نازل کی گئی ہے اور

رسول اکرمؐ کا' بالفاظِ قرآنِ کریم' یہ اقرار پہلے سامنے لایا جاچکا ہے جس میں آپؐ نے' اللہ کی شہادت کے ساتھ یہ فرمایا کہ مجھ پر یہ قرآن وحی کیا جاتا ہے۔

جب تک امت مسلمہ' اپنی حیات ارضی کا تمام کاروبار' اس قندیل نورانی کی روشنی میں طے کرنے کا عملاً اقرار نہیں کرتی' یہ کبھی بھی اپنی ذلت و پستی اور نکبت و زبوں حالی کی زندگی سے نہیں نکل سکتی' اور اس کے لئے کرنے کا کام یہی ہے کہ تمام امت کو **ما نزل علی محمد**' سے روشناس کرایا جائے۔ کیونکہ حضورؐ کو مخاطب کر کے یہی کہا گیا تھا کہ:

یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک

"اے رسول! جو کچھ آپ پر آپ کے رب (نشوونما دینے والے) کی طرف سے نازل کیا گیا ہے' اسے تمام انسانوں تک یکساں پہنچا دو"۔

اور ساتھ ہی یہ انذار بھی کہ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے فریضہ رسالت ادا نہیں کیا۔

وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ

اور اگر آپ فریضہ رسالت کو کماحقہ ادا کریں گے (یعنی قرآن کریم کو دوسرے انسانوں تک پہنچائیں گے) تو اللہ تعالیٰ آپ کو تمام (مخالف) انسانوں (کی شرانگیزیوں) سے محفوظ رکھے گا۔

واللہ یعصمک من الناس (5/67)

قرآن کریم نے' اپنی دفتین میں' بڑی شرح و بسط سے داستان بنی اسرائیل بیان کی ہے اور کہا ہے کہ بنی اسرائیل کو' بیک وقت تین تین قاتلان انسانیت' فرعون (شہنشاہیت کی قہرسامانیوں کا نمائندہ) قارون (سرمایہ داری کے شجرۃ الزقوم کا مظہر) اور ہامان (مذہبی پیشوائیت کی دسیسہ کاریوں کا نمائندہ) اپنے آہنی شکنجوں میں جکڑے ہوئے تھے جن سے اس مظلوم و مقہور قوم کو نجات دلانے کے لئے صاحب ضرب کلیم جیسا اولوالعزم پیغمبر بھیجا گیا جس نے قوم بنی اسرائیل کو ان کی اعصاب شکن گرفت سے نجات دلائی اور وہ قوم پھر سے آزادی کی فضاؤں میں حیات تازہ سے روشناس ہوئی۔

چونکہ حضورؐ ختمی المرتبت کی ساتھ' اللہ کی طرف سے سلسلۂ نبوت بند کر دیا گیا' اس لئے اب اس کی طرف سے کوئی صاحب ضرب کلیم نہیں آئے گا جو ہمیں ہمارے عہد کے سیاست دانوں' سرمایہ داروں اور مذہبی پیشواؤں کے چنگل سے آزاد کرائے۔ اس کے لئے امت مسلمہ میں سے ہی پہلے' وہ جماعت مومنین پیدا کرنا ہو گی جسے حاکم کائنات کی یہ ضمانت حاصل ہو سکے کہ کوئی دوسری قوم اسے اپنی زیر نگیں نہیں بنا سکے گی اور پھر یہی جماعت' اقوام عالم میں یہ حیثیت حاصل کرنے کے بعد' باقی امت مسلمہ اور اس کے ساتھ ساتھ تمام انسانیت کو اس جادۂ حق پر چلائے گی جس کے متعلق اس دستور کامل کے دینے والے نے یہ کہہ رکھا ہے

کہ

ان ھذا القرآن یھدی للتی ھی اقوم (17/9)

"بے شک یہ قرآن (سفر زندگی میں) اس راہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو متوازن ترین ہے"۔

اس کے سوا ہماری باز آفرینی کی کوئی دوسری صورت نہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

ہندوستان میں' مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے اولیں نقیب' سر سید احمد خاں نے بھی اسی کو (رجعت الی القرآن کو) اپنی زندگی کا مقصد بنا کر' امت مسلمہ میں روح تازہ پیدا کی۔ حکیم الامت علامہ محمد اقبالؒ کی بھی عمر بھر یہی پکار رہی اور اپنے ان عظیم فرزندانِ ملت کے تسلسل میں مفکرِ قرآن علامہ غلام احمد پرویزؒ بھی تمام عمر قوم کو اسی راہِ حق پر جادہ پیما کرنے کی سعی کرتے رہے اور اس وقت بھی طلوع اسلام کی دعوت یہی ہے۔

یاد رکھئے' قرآنِ کریم کی طرف دعوت دینے والوں اور اس کے ذریعہ دیئے گئے نظام حیات کے نقوش دنیا کے سامنے پیش کر کے' اسے قائم کرنے کی کوششیں کرنے والوں کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ ان کے صرف قدم اٹھانے کی دیر ہے۔ اللہ انہیں سامان حفاظت بہم پہنچانے کا ضامن ہے۔

جو مذہبِ اسلام' اس وقت ہمارے ہاں صدیوں سے چلا آرہا ہے' اور جسے قائم رکھنے کے لئے سیاست دان' سرمایہ دار اور مذہبی پیشوا' باہم مل کر صف آرا ہیں' یہ اس دین کی ممی شدہ لاش ہے جسے اللہ نے اپنے آخری رسولؐ کے ذریعہ ہمیں دیا اور جسے قبول کرنے کی اس نے ان الفاظ میں ہدایت کی ہے کہ

استجیبو اللہ وللرسول اذا دعا کم لما یحییکم (8/24)

"(اے جماعت مومنین!) اللہ اور اس کے رسول کی اس دعوت پر لبیک کہو جو تمہیں زندگی عطا کرنے والی ہے"۔

قوموں کو زندگی وہ دستورِ حیات ہی دے سکتا ہے جو خدائے زندہ کا عطا کردہ ہے۔

امت مسلمہ ہی کی نہیں' پوری کی پوری نوعِ انسانی کی فلاح و بالیدگی صرف اس دستور کے مطابق نظام کے قیام میں ہے جسے اللہ نے اپنے آخری رسولؐ پر وحی کیا اور جس منشور کو رسولؐ اللہ نے پورے انصاف کے ساتھ بنی نوعِ انسان تک پہنچا کر' اپنی حیاتِ ارضی کے اختتام سے پہلے' اپنے آخری حج' حجتہ الوداع کے موقع پر جمع شدہ تمام انسانوں سے استفسار کر کے کہ کیا میں نے اللہ کا پیغام تم تک پہنچا دیا ہے؟ ان سے شہادت لی کہ ہاں آپؐ نے ایسا یقیناً کر دیا ہے۔

آیئے محترم بشیر احمد عابد کی اس دعا میں ہم بھی شریک ہو جائیں کہ:

"اے خدا! ہمیں فاسق ہونے سے بچا لے اور اپنی ہدایت سے محروم نہ رکھ! ہمارا ایمان ہے کہ ہمیں تیرے ہی دامن میں پناہ مل سکتی ہے اور تیرے ہی دین کے قالب میں رہ کر ہماری صلاحیتیں برومند ہو سکتی ہیں اور ہم تیری ہی رہنمائی میں اپنی منزل مقصود کو پا سکتے ہیں۔ ہم تیرے ساتھ یہ عہد کرتے ہیں کہ ہمیں تیرے دین کے سوا کچھ عزیز نہیں"۔

اور پھر اس کے بعد اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیں کہ ہم یہ دعا مانگنے میں مخلص ہیں۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم (2:127)

یاد رکھئے کہ ایسا کرنا ہمارے اپنے مفاد میں ہے۔ اگر ہم ایسا کر لیں تو ہمیں وہ سرفرازی و سربلندی عطا ہو گی جس کی ضمانت اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بہم پہنچائی ہے کہ

انتم الاعلون ان کنتم مومنین (3:139)

اور جسے اقبالؒ نے اس خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے کہ

مومنے بالائے ہر بالا ترے
غیرت اُو برنتابد ہمسرے

(مومن ہر بلند سے بلند انسان سے بلند ہوتا ہے۔ اس کی غیرت کسی غیر مومن کی ہمسری تک گوارا نہیں کرتی)

اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اس کا قانون ہمارا منہ نہیں دیکھتے رہیں گے۔ اس نے کہہ رکھا ہے کہ

وان تتولوا یستبدل قوما غیر کم ثم لا یکونوا امثالکم (47:38)

اگر تم اس نظام سے روگردانی کرو گے اور اپنے عہد سے پھر جاؤ گے تو اللہ تمہاری جگہ دوسری قوم لے آئیگا جو پھر تمہارے جیسی نہیں ہو گی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس روز بد سے محفوظ رکھیں جس کی طرف حضرت علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

ترسم از روزے کہ محرومش کنند
آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند!

میں اس دن سے ڈرتا ہوں کہ (وراثت سے) محروم کر دیا جاؤں اور جس حیات بخش شرر کا مسکن میرا دل ہونا تھا وہ کسی اور کے دل کو روشن کرے گی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تونگر بھکاری

(محمد اسلم رانا)

ایک کمزور و ناتوان- غریب و نادار بھکاری کی یہ حالت تھی کہ بیچارا صبح سے شام تک ایک ایک شخص کے سامنے دست سوال دراز کرتا- ہر ایک دروازے پر جھولی پھیلاتا تو بمشکل اتنا پاتا کہ اس سے اپنا پیٹ پال سکے- کبھی اتنا بھی نہ ملتا تو فاقہ کاٹتا- اس کی ساری عمر یونہی بسر ہو گئی- وہ مرتے وقت وصیت کر گیا کہ اسے اس کی جھونپڑی میں ہی دفن کر دیا جائے- جب اس کی قبر کھودی گئی تو لوگ کیا دیکھتے ہیں کہ نیچے پرانے وقتوں کا ایک گراں بہا خزانہ مدفون ہے- بھکاری کی تباہ حال زندگی اور یہ خزانہ ! _____ لوگوں کے لئے عبرت و موعظت کی ہزار داستانیں اپنے اندر رکھتا ہے-

بھکاری اور خزانے کا واقعہ حقیقت ہو یا افسانہ- مگر کیا یہ حقیقت نہیں کہ آج مسلمان کی بھی یہی حالت ہو رہی ہے- وہ اس دنیا میں ہر ایک کا دست نگر ہے' اور نہیں جانتا کہ اس کے پاس ایک ایسا خزانہ موجود ہے جو اسے ساری دنیا سے بے نیاز کر دے-

بھکاری کے دکھ کا علاج اسے ایک پیسہ خدا کی راہ میں دے دینا یا اس کی طرف روٹی کا ٹکڑا پھینک دینا نہ تھا- بلکہ اس کی سچی مدد یہ تھی کہ کسی اللہ کے بندے کو معلوم ہوتا تو اسے اس خزانے کا پتہ دے دیتا- آج مسلمان کی مصیبتوں کا مداوا بھی یہی ہے کہ اسے اس کے چھپے ہوئے خزانے سے روشناس کرا دیا جائے' جو اس کی خستہ سامانیوں کو سرفرازیوں اور سربلندیوں میں بدل دے- یہ متاع گراں بہا قرآن کریم ہے جو ایک عرصہ سے مسلمان کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے اور اب یہ اتنا بھی نہیں جانتا کہ اس کے اندر ہے کیا !!!

(تحریک طلوع اسلام اسی چھپے ہوئے خزانے کی تلاش کا نام ہے-- ایڈیٹر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟

(یہ مضمون کنونشن 94ء میں پڑھا گیا)

(علی محمد چدھڑ)

خدا کا تجویز کردہ نظام زندگی "الدین یا الاسلام تمام نوع انسان کی عالمگیر راہنمائی کا داعی ہے۔ جس کے راہنما اصول قرآن کی شکل میں ہمارے پاس موجود و محفوظ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنی راہنمائی کو 'ذکر للعالمین' کہا ہے۔ یعنی تمام اقوام کیلئے ضابطۂ حیات۔ دوسرے مقام پر اس کی تشریح ان الفاظ سے کر دی کہ "اس کی مثال ایک ایسے درخت کی ہے جس کی جڑیں پاتال میں ہوں اور شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں اور وہ قانون خداوندی کے مطابق ہر زمانے میں ہر وقت پھل دیتا جائے (14/24-25)"۔ حضرت علامہ اقبال کے الفاظ ہیں

یہ نغمۂ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ

مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ اور علامہ اقبالؒ کی آرزو یہ تھی کہ ایسا خطہ زمین حاصل کیا جائے جسے قرآنی نظام کی تجربہ گاہ بنایا جائے۔ اور خلفائے راشدینؓ کا دور واپس لا کر دنیا کو بتا دیا جائے کہ اسلام کے قرآنی حقائق نہ کسی خاص قوم کیلئے مختص ہیں اور نہ کسی خاص زمانے تک محدود۔ لیکن نصف صدی کا ایک ریکارڈ Period گذرنے کے باوجود یہاں اسلامی نظام نافذ نہ ہو سکا۔ اس سے مخالفین یہ نتیجہ اخذ کرنے لگے کہ حضرت علامہؒ کی یہ آرزو محض شاعرانہ تخیل پر مبنی تھی۔ قرآن میں کسی زمانہ میں تو اس کی صلاحیت تھی کہ اس کی بنیاد پر قابلِ عمل نظامِ حکومت وجود میں آگیا۔ لیکن اب اس میں اس کی صلاحیت نہیں رہی۔

افسوس ناک بات تو یہ ہے کہ ایسی رائے قائم کرنے میں اغیار کے ساتھ ساتھ ہمارے مذہبی اکابر بھی برابر کے شریک ہیں۔ تحریکِ پاکستان کے تو وہ مخالف تھے ہی۔ لیکن اس زورِ دروں میں وہ قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کے تصور اسلام کے بھی منکر ہو گئے۔ وجہ انکار محض یہ ہوئی کہ اس سے ان کے فرقہ وارانہ اسلام کی

اجارہ داری باقی نہیں رہتی۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ یہ حضرات ہر فرقہ کے پرسنل لاز کی آزادی کا ذکر تو ہر جگہ کرتے ہیں لیکن پبلک لاز سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی جس کا مطلب یوں سمجھیں کہ یہ اس انداز کا اسلام چاہتے ہیں جسکے داعی حسین احمد مدنی (مرحوم) اور ان کے ہمنوا تھے اور جس پر عمل درآمد ایک سیکولر حکومت میں بھی ممکن تھا۔

مزید برآں احیائے اسلام میں رکاوٹ اور تاخیر کا ذمہ دار ایک اور عنصر بھی ہے اور وہ ہے جماعتِ اسلامی۔ کسی اسلامی مملکت کے قیام کی شرط اولین یہ ہے کہ اس میں پبلک لاز کا ایسا ضابطہ وضع کیا جائے جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو سکے۔ اسے ناممکن کرنے کے لئے جماعت اسلامی کے بانی مولانا مودودی نے ایک خاص انداز اختیار کیا۔ بیس پچیس سال تک تو وہ یہ کہتے رہے کہ اسلامی حکومت کی بنیاد 'کتاب و سنت' پر ہے لیکن بعد ازاں یہ فرما دیا کہ کتاب و سنت کی رو سے پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں کیا جا سکتا جسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کر لیں' کھلے الفاظ میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ اب دنیا میں اسلامی حکومت قائم ہو ہی نہیں سکتی۔ چنانچہ ان کے پیش کردہ اس نظریہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری نئی نسل اسلام کے مستقبل کی طرف سے مایوس ہو گئی۔ یہاں تک کہ آجکل نوجوان طبقہ یہ کہتا سنا جا رہا ہے کہ جب اسلامی حکومت قائم ہی نہیں ہو سکتی تو پھر پاکستان کی جداگانہ مملکت کی کیا ضرورت تھی؟۔ اندازہ فرمائیں کہ قومی نقطہ نگاہ سے ایسی صورتِ حال کتنی سنگین ہے۔ یقیناً نئی نسل کے ان الفاظ سے سرسیدؒ سے اقبالؒ اور پھر قائداعظمؒ تک سارے کئے کرائے پہ پانی پھر جاتا ہے۔ جس کا سہرا 'کتاب و سنت' کے ان شیدائیوں کے سر ہے جنہوں نے نصف صدی کا ایک طویل زمانہ اپنے تاخیری حربوں اور فرقہ وارانہ چپقلش کی نذر کر دیا اور یوں ساری امت مسلمہ کو ایک ترقی معکوس سے دوچار ہونا پڑا۔ علامہ اقبالؒ نے جب یہ کہا تھا کہ "اسلام کو باہر سے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اس کے زوال کا باعث یہی اندرونی سازشیں ہیں" تو انکے سامنے انکی یہی تخریبی کارفرمایاں ہو سکتی ہیں۔

ظاہر ہے ایک ایسی مملکت جو دین کے نام پر حاصل کی گئی ہو اگر اتنے طویل عرصہ کیلئے اسلامی نظام سے محروم رہے تو پھر وہاں اسلام کے متعلق "ناممکن العمل" اور "چلے ہوئے کارتوس" کی مہمل اصطلاحوں کا سنا جانا کوئی بعید از قیاس نہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اگر اس مفروضے کو وقتی طور پر بھی تسلیم کر لیا جائے تو دین کی ساری عمارت منہدم ہو جاتی ہے۔ اور قرآن پر ہمارا ایمان متزلزل ہو جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر اسلام واقعی اب 'ناممکن العمل' ہو چکا ہے تو پھر قرآنِ مجید کے قیامت تک کیلئے محفوظ رکھنے کا کیا مقصد رہ جاتا ہے۔ مزید برآں خدا کے اس دعوے کے متعلق ہماری کیا رائے ہو گی جس میں کہا گیا ہے کہ "اللہ نے اپنے رسول کو یہ ضابطۂ ہدایت اور حق پر مبنی نظام (اسلام) دیکر بھیجا ہی اس لئے ہے کہ یہ دنیا کے تمام خود

ساختہ نظامہائے زندگی پر غالب آکر رہے 48/28" اور یہ بھی کہ "اللہ کبھی بھی وعدہ خلافی نہیں کرتا 3/8"
یہاں یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ یہ اس دین کے متعلق کہا گیا ہے جس کی اساس تمام تر قرآنِ خالص پر ہے نہ کہ اس خود ساختہ مذہب کے متعلق جسے فقہ و روایات سے مزین کر کے مروجہ اسلام کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ بدقسمتی سے یہی مروجہ اسلام اس وقت ساری دنیا میں چل رہا ہے اور اسی کو مسلمان قوم سینے سے لگائے بیٹھی ہے۔ ایک اور بنیادی غلطی یہ ہے کہ حقیقی اسلام اور مسلمان قوم کو ایک ہی تصور کر لیا گیا ہے۔ اس طرح مسلمانوں کی پستی اور زبوں حالی کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کر لیا جاتا ہے کہ اسلام دنیا میں ناکام رہا ہے۔ اس کی مثال یوں ہوئی جیسے ایک مریض کسی ڈاکٹر سے علاج کراتا ہے اور اس کے نسخے سے اسے آرام آنا شروع ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ اس نسخہ کا استعمال ترک کر کے کسی جعلی حکیم کا علاج شروع کر دیتا ہے اور پھر بیمار ہو جاتا ہے اس سے کیا آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اس پہلے ڈاکٹر کا نسخہ ناکام ہو گیا یا یہ کہیں گے کہ اس مریض نے اس نسخہ کو چھوڑ کر جعلی حکیم سے علاج کرایا اور مرض کو پھر بلا لیا۔ خیر یہ تو ایک بات مثالاً" سامنے آگئی آیئے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ اسلام دراصل ہے کیا۔ تخلیق کائنات کے وقت خدا نے اس سارے سلسلہ کے طریقہ کار کے لئے کچھ مستقل اور غیر متبدل قوانین مقرر کر دیئے۔ جن پر عمل درآمد کے لئے ایسی خود کار مشینری بنا دی کہ کسی کل پرزے کو ذرا بھر سرتابی کی گنجائش نہیں۔ مثلاً زمین و آسمان۔ سورج۔ چاند ستارے وغیرہ سب اپنے اپنے فرائض میں مگن ہیں اور اپنی ابتدا سے لیکر اب تک پچھلے اربوں کھربوں سالوں میں ان سے کسی قسم کی کوئی لغزش نہیں ہوئی اور اس طرح یہ سارا سلسلہ بڑی کامیابی کیساتھ چل رہا ہے۔ جس طرح خدا نے سلسلۂ کائنات (خارجی دنیا) کے لئے غیر متبدل قوانین متعین کئے ہیں اسی طرح اس نے انسانی دنیا کیلئے بھی ایسی محکم اور مستقل اقدار (بذریعہ وحی) عطا کی ہیں جن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے افراد اور اقوام کو اس دنیا کی زندگی میں بھی ہر قسم کی شادابیاں اور سرفرازیاں حاصل ہوتی ہیں اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی کامیابیاں اور کامرانیاں۔ لیکن انسان کو چونکہ دیگر اشیائے کائنات کی طرح مجبور پیدا نہیں کیا۔ اس لئے اسے اس کا اختیار ہے کہ وہ چاہے تو ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے تو ان سے انحراف برت کر اپنے خود ساختہ مسلک پر گامزن ہو جائے۔ اول الذکر راستہ اسے عروج و ارتقاء کی طرف لے جائے گا اور ثانی الذکر مسلک زوال و انحطاط کی طرف۔ اب معترض حضرات سے ہمارے سوال کی شکل یہ بنے گی کہ جب تسلیم شدہ حقائق کے مطابق کائناتی اور انسانی راہنمائی کا سرچشمہ ایک ہے تو انسانی دنیا کا نظام کیسے ناممکن العمل ہو گیا جبکہ کائناتی نظام بدستور بغیر کسی خلل کے آگے چل رہا ہے۔ دراصل انسانی راہنمائی کے لئے جو حقائق عطا ہوئے ہیں' انہی کا نام اسلام ہے۔ ان حقائق کی نمو تخلیقِ کائنات کیساتھ ہی ہو گئی اور انہوں نے رفتہ رفتہ آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ راستے میں مختلف زمانوں

میں مختلف اقوام نے انہیں اپنایا تو انہیں سرفرازیاں اور خوش گواریاں نصیب ہو گئیں۔ انہوں نے ان حقائق کا ساتھ چھوڑ دیا تو باقی اقوام کی طرح مصیبتوں کا شکار ہو گئیں۔ قرآن نے حضرت نوحؑ سے لیکر نبیؐ کریمؐ تک اس ساری راہنمائی کو ایک ہی دین سے مربوط اور منسوب کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ "یہ کوئی نیا دین نہیں (اصلا") وہی دین ہے جو نوحؑ اور اس کے بعد دیگر انبیاءؑ کو بذریعہ وحی دیا گیا تھا۔۔۔۔ جو ابراہیمؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ اور ان کی اولاد کو دیا گیا تھا۔ جو عیسیٰؑ، ایوبؑ، یونسؑ، ہارونؑ، اور سلیمانؑ کو دیا گیا تھا۔ یہی ضابطۂ ہدایت (دیگر انبیاء کی طرح) داؤدؑ کو بھی دیا گیا تھا اور خود یہودیوں کے پیغمبر موسیٰؑ سے بھی خدا نے یہی باتیں کی تھیں 163 /4" اس کے بعد آیت نمبر 4/166 میں حضور نبیؐ کریمؐ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا "اب وہی دین علم و بصیرت کی بنیادوں پر تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے۔ اسپر خود خدا کی شہادت موجود ہے اور اس کی کائناتی قوتوں کی شہادت پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ کائنات میں ہر کام قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ اور قانون ہی کے مطابق ہر کام کا نتیجہ مرتب ہوتا ہے اور وہ بنیادی شہادت جس کے بعد کسی خارجی شہادت کی ضرورت باقی نہیں رہتی خود اس قانون خداوندی کی داخلی شہادت ہے۔ یہ اپنے نتائج سے بتا دے گا کہ میں اس خدا کا قانون ہوں جس کا قانون ساری کائنات میں جاری و ساری ہے"

چنانچہ یہ اسی دین کی آسمانی ندی ہے جو حضرت نوحؑ سے لیکر اب تک انسانیت کی سیرابی کیلئے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ اپنے اپنے وقت میں جو قوم بھی اس ندی سے سیراب ہوئی لہلہا اٹھی۔ اسی تاریخ کے ایک دور میں عرب کی قوم نے ایسا کیا تو **انتم الاعلون** کا نمونہ سامنے آگیا۔ اپنے پیغمبرؐ کی راہنمائی میں مومنین کی جماعت نے جب اسی دین کے حقائق (قرآن) کو اپنایا تو ایسے محیر العقول نتائج سامنے آئے کہ تاریخ کے اوراق میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ سب کچھ اس جماعت کے اعمالِ صالح سے ہوا تھا' جنہوں نے ان قوانین کے نتائج میں غیر معمولی تیزی پیدا کر دی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہا جاتا ہے کہ اسلام میں آگے بڑھنے کی صلاحیت موجود تھی۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اور انسانی اعمالِ صالحہ ان حقائق (قرآن) کے ساتھ نہ رہے۔ لہٰذا ان حقائق نے اپنی سابقہ رفتار کے مطابق ست روی سے چلنا شروع کر دیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جس کے متعلق دنیا کے مورخین یہ کہتے ہیں کہ اسلام صرف اس وقت تک کامیاب رہا۔ اس کے بعد زمانے کے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکا اور ناکام ہو گیا حالانکہ جو کچھ فی الحقیقت ہوا وہ صرف اسقدر ہے کہ اسلام اپنی معمولی رفتار سے چلا آرہا تھا۔ درمیان میں اسے خارجی قوت مل گئی جس سے اس کی رفتار میں غیر معمولی تیزی پیدا ہو گئی۔ بعد میں وہ خارجی قوت الگ ہو گئی اور اسلام پھر اپنی سابقہ رفتار سے چلنے لگ گیا۔ بالفاظ دیگر نہر اپنی معمولی رفتار سے بہہ رہی تھی۔ ایک مقام پر ٹھوکر (FALL) کیوجہ سے اسکی رفتار غیر معمولی طور پر تیز ہو گئی۔ جب یہ خارجی تحرک ختم ہو گئی تو پھر وہ اپنی سابقہ رفتار سے

بہنے لگ گئی۔ یہ کہنا کہ نہر صرف اتنے وقت تک بہتی رہی جب تک اس کی لہروں سے اس کی رفتار محسوس طور پر نظر آتی تھی اور اس کے بعد وہ جوئے رواں کی بجائے ساکت و ساکن جوہڑ بن گئی کم **نگہی**۔ منفی سوچ اور تعصب کی دلیل ہے۔

اب ہم معترضین کے اس سوال کی طرف آتے ہیں کہ کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟ یا اس میں اب بھی آگے چلنے کی صلاحیت ہے۔ اس سوال کا درست جواب یہ بنتا ہے کہ "اب بھی آگے چلنے کی صلاحیت" تو ایک طرف پچھلے ڈیڑھ ہزار سالوں میں دنیا میں چلا ہی اسلام ہے۔ کوئی دوسرا نظام چلنے کے قابل ہی نہیں ہوا یہ جواب بڑا تعجب انگیز نظر آئے گا لیکن اگر تاریخی شواہد سو فیصد اس کی تائید کرتے نظر آئیں تو ان نکھرے ہوئے حقائق سے انکار بھی ممکن نہیں۔

آیئے پہلے اس زمانے کی تاریخ کا مطالعہ کریں جب قرآن نازل ہوا اور اس کے بعد اب تک ڈیڑھ ہزار سالہ انسانی تاریخ کا جائزہ لیں۔ اس سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ اس عرصہ میں انسان مختلف تجارب کے بعد ان تصورات کو اختیار کرتا چلا آرہا ہے جو قرآن نے دیئے تھے یا ان تصورات کی طرف جا رہا ہے جو قرآن سے پہلے دنیا میں عام طور پر پھیلے ہوئے تھے۔ تاریخی شواہد اور قرآنی تصورات سے جو کچھ اخذ ہوتا ہے۔ اس کا خلاصہ کچھ اس طرح سے ہے۔

1- قرآن سے پہلے انسانی ذہن کا فیصلہ تھا کہ ملوکیت عین فطرت انسانی کے مطابق نظام جہاں بانی ہے۔ قرآن نے اس کی تردید کی اور کہا کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر حکم چلائے اور یہ بھی کہ انسانوں کو اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کرنے چاہئیں۔

2- انسانی ذہن کا اس وقت یہ فیصلہ تھا کہ غلاموں کا وجود معاشرہ کا جزو لاینفک ہے اور فطرت کی صحیح تقسیم کا نتیجہ ہے۔ قرآن نے یہ انقلابی تصور دیا کہ تمام انسان یکساں واجب التکریم ہیں اور کسی فرد کا دوسرے فرد کو غلام بنا لینا یکسر خلاف انسانیت ہے۔

3- ذہن انسانی اس وقت نسلی اور قبائلی تفریق اور فوقیت کا قائل تھا۔ قرآن نے اس کے مقابلہ میں اعلان کیا کہ انسان کی قدر و قیمت اس کے جوہر ذاتی سے ہے۔

4- اس زمانہ میں ذہن انسانی کا فیصلہ یہ تھا کہ قومیں شخصیتوں کے سہارے آگے بڑھتی ہیں۔ قرآن نے اسکی تردید کی اور بتایا کہ اب قومیں نظریات کی بنیاد پر مرتب ہونگی اور اپنے نظام کی خوبیوں کے سہارے آگے بڑھیں گی۔

5- اس زمانے میں جاگیرداری۔ زمینداری اور سرمایہ پرستی کا نظام عین مطابق فطرت سمجھا جاتا تھا۔ قرآن نے یہ انقلاب انگیز تصور پیش کیا کہ وسائل و ذرائع پیداوار کسی انسان کی ذاتی ملکیت میں نہیں رہ سکتے

اور زر و مال کا جمع کرنا انسانیت کی عدالت میں بدترین جرم ہے۔

6- اس زمانے میں مختلف خاندانوں۔ قوموں کا تصور تو تھا۔ لیکن عالمگیر انسانیت کا تصور کسی کے سامنے نہ تھا قرآن نے کہا کہ تمام نوع انسانی ایک عالمگیر برادری ہے۔ لہٰذا تمام دنیا کا نظام حکومت ایک ہونا چاہئے۔

اگر ایک ایک کر کے مندرجہ بالا تصورات اور اصولوں پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو یہی اخذ ہوتا ہے کہ اس دور کے بعد زمانہ نے وہی فیصلہ کیا جسے قرآن نے پیش کیا تھا۔ صدیوں کے تجربات اور پیہم ناکامیوں کے بعد انسانی عقل انہی قرآنی نظریات کو اپنانے کیلئے مضطرب ہے۔ جنہیں صدیوں پہلے وہ ٹھکرا چکی تھی۔ موجودہ زمانے کا رخ کیا اسی قرآنی تصور کو گلے لگانے کی طرف نہیں ہے جسے وہ ڈیڑھ ہزار سال قبل ٹھکرا چکا ہے۔ یقیناً ایسا ہی ہے اور کوئی دوسری صورت ہرگز نہیں ہے۔

قارئین کرام! اسلام کیا ہے۔ وہ قرآن کے حوالہ سے مدلل شکل میں ہمارے سامنے آگیا اور ہمیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جب مخالف عناصر اسلام کو ناممکن العمل کہتے ہیں تو ان کے پیش نظر کونسا اسلام ہوتا ہے۔ اب جبکہ "الدین" یعنی قرآنی اسلام کی حقیقت معلوم ہو گئی تو ہم پورے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ دور میں اس کے حقائق اپنی ست روی سے آگے بڑھ رہے ہیں اور زمانہ غیر محسوس طور پر اسلام سے متاثر ہو رہا ہے۔ اگر ہمیں صدر اول جیسے مطلوبہ نتائج بہ سرعت حاصل کرنے ہیں تو اس کے لئے اسلام کے حقائق کو انسانی اعمالِ صالح سے متحرک کرنا لازمی ہے۔ اعمالِ صالح سے مراد وہ کام ہیں جنہیں قانونِ خداوندی (قرآن) صحیح تسلیم کرتا ہے۔ سورہ الانعام میں فرمایا کہ "(اے رسول) تم اس ضابطۂ خداوندی کا اتباع کرتے جاؤ جو تمہارے رب کی طرف سے وحی کیا گیا ہے۔ یاد رکھو خدا کے سوا کسی اور کا قانون ایسا نہیں جس کا اتباع کیا جائے (6/107) معلوم یہ ہوا کہ اعمالِ صالحہ کیلئے قرآن کا اتباع ناگزیر ہے اور فرمانِ الٰہی کے مطابق قرآن کے سوا کسی اور کا ضابطہ ایسا نہیں جس کا اتباع کیا جائے۔ لہٰذا اس کے قانون کیساتھ کسی اور کے خود ساختہ قانون کو شریک نہیں کیا جا سکتا۔ ان حقائق کی روشنی میں دنیا کے سامنے اسلام کو ہر زمانے کے تقاضوں کے عین مطابق ایک سدا بہار دین (نظام حیات) ثابت کرنے کا تقاضا ہے کہ مملکتِ خداداد میں قرآن خالص کا نظام نافذ کر دیا جائے۔ صرف پانچ سال کی آزمائش مدت کیلئے۔ گھبرایئے نہیں! جب گوناگوں مشہود نتائج سامنے آنے شروع ہو گئے تو مدت کی توسیع کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہو گی اور عوام الناس اسلام کی نعمتوں اور خوشگواریوں سے دوبارہ محرومی کبھی برداشت نہیں کریں گے۔ بھلا سیب اور انار کی لذت سے ایک بار آشنا ہو کر یہ کون برداشت کرے گا کہ اس کے بعد اسے امرود اور لسوڑوں پر ٹرخا دیا جائے۔ قرآنی نظام کی بہاریں ہی ایسی ہیں کہ ان سے محرومی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

کتاب اللہ ہماری مشترکہ میراث ہے اور ایک مکمل دستورِ حیات کے ساتھ ساتھ بنی نوعِ انسان کی ضروریات کیلئے ابد تک کافی ہے۔ مروجہ اسلام اور فقہی مذاہب نے مسلمانوں کو آج تک سوائے ذلت۔ رسوائی اور انتشار کے اور کچھ نہیں دیا۔ نتائج ہمارے سامنے ہیں اور دین میں حق و باطل کا معیار نتائج ہی فراہم کرتے ہیں۔ سورہ الانعام میں پیغمبرؐ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ (اپنے مخالفین سے) کہہ دو کہ اس ضابطہء زندگی کے مشہود نتائج میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرنے کیلئے کافی ہوں گے (6/136) اور آخر میں ایک حتمی بات۔ ہمارے مذہبی اکابرین جیتے جی اپنے فقہی مذاہب کو کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ لیکن اگر مقتدر حضرات نفاذِ اسلام کیلئے قرآن کو بنیاد بنا لیں اور ابتدائی اقدامات ہاتھ میں لے لیں۔ تو پھر خدا کے قانون میں اتنی خصوصیت ہے کہ وہ اپنے لئے خود راستہ بنائے اور سدِ راہ بننے والی تمام قوتوں سے نبرد آزما ہو سکے۔

دینی اداروں و مساجد کیلئے خوشخبری

دینی ادارے و مساجد، مالی معاونت کی رہنمائی کے لیے فوری لکھیں

تفصیلات کے لیے:

اسلامک انٹرنیشنل ویلفیئر آرگنائزیشن رجسٹرڈ

37 - پی گلبرگ 2 (نزد منی مارکیٹ) لاہور 54660

فیکس: 5756333/5755222-5755444

روزہ اور فدیہ

محترم پرویزؒ صاحب اپنی مطالب الفرقان کی جلد سوم کے صفحہ 186 میں سورۃ بقرہ کی آیت 184 کے حوالہ سے کچھ یوں رقم طراز ہیں کہ "یہ صیام (روزے) گنتی کے دنوں کے ہیں۔ پھر جو کوئی تم میں سے مریض ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں اس گنتی کو پورا کرے۔ لیکن اگر شکل یہ ہو کہ ایک شخص نہ تو بیمار ہے اور نہ حالات سفر میں لیکن طبعی طور پر اس کی مستقلاً" حالت یہ ہے کہ وہ روزے کو مشقت نباہ سکتا ہے (تو اس کے لئے دوسرے دنوں میں روزے پورے کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا) اسے چاہئے کہ روزے کے عوض کسی حاجت مند کی روٹی کا انتظام کر دے۔"

پرویزؒ صاحب کی اس تشریح کو مان لیا جائے تو ہمارے پاکستان میں لاکھوں افراد ایسے ہوں گے جن پر یہ حکم لاگو ہوگا' کم سے کم انہی سے فدیہ وصول کر لیا جائے تو بھی غربت اور افلاس کو کم کیا جا سکتا ہے۔ کوئی حوصلے والا ایماندار ہے؟ جو اس فریضہ کا بوجھ اٹھا سکے اور منظم طریقے پر فدیہ وصول کر کے محتاجوں میں تقسیم کر سکے۔

المشتہر: انجمن فقہ قرآنیہ
414 یونی شاپنگ سینٹر
عبداللہ ہارون روڈ کراچی

قرآن اور آپ کا گھر

- کیا آپ کے گھر میں قرآن پڑھا جاتا ہے؟
- بالغ افراد میں سے کتنے ہیں جو قرآن پڑھتے ہیں؟
- بچوں میں سے کتنے قرآن پڑھتے ہیں؟
- کیا بچوں کو قرآنی قصص و واقعات سنائے جاتے ہیں؟
- کیا گھر میں قرآن کی آیات اور احکام پر باتیں ہوتی ہیں؟
- بڑوں اور بچوں کو قرآن میں سے کیا کچھ یاد ہے؟
- بڑوں یا بچوں میں سے قرآن کا مفہوم سمجھنے یا ترجمہ جاننے والا بھی کوئی ہے؟
- کیا گھر میں قرآن کو سمجھنے کے لئے کچھ کتابیں موجود ہیں؟
  (مثلاً ترجمے' تفسیریں' قرآنی مضامین و مقالات)
- کیا قرآنی آیات یا ان کے تراجم کے کتبے دیواروں پر آویزاں ہیں؟
- کیا گھر کے مرد یا خواتین کسی حلقہ درس قرآن میں حصہ لیتی ہیں؟

محض آپ کے غور و خوض کے لیے

کتبہ ازاں شیخ احسان الحق صاحب گجرات

شرائط رکنیت :-

1- باغبان کم از کم دس (10) پھل دار پودہ جات کی فہرست پیش کرے۔
2- دو (2) روپے سالانہ چندہ رکنیت ادا کرے۔ یا
3- ایک (100) سو روپے ادا کر کے تاحیات ممبر شپ قبول کر لے۔

(نوٹ) ممبر شپ کے لئے چندہ رکنیت اور فہرست پودہ جات بمع فوٹو سٹیٹ شناختی کارڈ درکار ہو گی۔

ضابطہ اخلاق اور عملی طریق کار :-

میں بحیثیت رکن باغبان ایسوسی ایشن عہد کرتا ہوں کہ

1- دیمک، طوطے، چوہے، چمگادڑ اور پودہ جات کی بیماریوں کے خلاف عملی جہاد اور حکومت تک اپنی مشکلات اور مسائل پہنچانے میں بھرپور تعاون کروں گا۔
2- سال میں ایک پورا دن باغبان ایسوسی ایشن کے لئے وقف کیا کروں گا۔
3- اپنے احباب کو پھلوں اور پودہ جات کا تحفہ دیا کروں گا تاکہ باغبان تحریک ترقی کرے اور "باغبان نرسری" کے قیام میں تعاون کروں گا۔
4- ہر ماہ کسی ایک دن کے ایک وقت میں صرف پھل (فروٹ) کھانے پر اکتفا کروں گا تاکہ پھلوں کی اہمیت میں اضافہ ہو اور جنت کی تمثیلی غذا استعمال ہو۔
5- شہد کی کھیاں پال کر شہد حاصل کرنے اور پھلوں کی پیداوار بڑھانے کے عمل کو متحدہ رکھوں گا۔ شہد بھی اہل جنت کی تمثیلی غذا ہے۔

پتہ رابطہ

ملک محمد حنیف وجدانی
صدر باغبان ایسوسی ایشن
معرفت موہڑہ سیداں مری۔ PC No. 47224

تعاون

زرعی یونیورسٹی فیصل آباد۔ بارانی زرعی یونیورسٹی مری
روڈ راولپنڈی، زرعی ترقیاتی بنک اسلام آباد

یاد رفتگان

سال 1995ء شروع ہوتے ہی محترمہ ثریا عندلیبؒ صاحبہ کے جواں سال صاحبزادے تنویر ازھر وفات پا گئے۔ یہ غم ابھی تازہ ہی تھا کہ ڈاکٹر محمد اکرم مرزا موت کے حق میں دستبردار ہو گئے۔

مرحوم تنویر ازھر "پرائیویٹ پاور اینڈ انفراسٹرکچر بورڈ" کے صدر اور NES PAK کے نائب صدر تھے۔ بجلی کے ملک گیر بحران پر قابو پانے کے لئے جامع اور مربوط پالیسی وضع کرنے اور اسے روبہ عمل لانے میں وہ کلیدی حیثیت رکھتے تھے۔ قرآنی فکر کی شیدائی ماں کی گود میں پرورش پانے والے اس نوجوان کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے صدر مملکت جناب فاروق احمد خان لغاری نے فرمایا

As President Power and Infra-structure Board, Late Tanveer Azhar made very solid and singular contribution in the energy policy of the Country. His untimely death has deprived the Nation of a young intelligent and devoted person who worked very hard for the success of Energy Policy and other power projects in the Country.

اپنے خط میں وزیر اعظم محترمہ بینظیر بھٹو صاحبہ نے کہا

Late Mr. Tanveer Azhar will be long remembered for his professional accomplishments and contributions in the field of power generation in the Country.

تحریک طلوع اسلام کا ایک ایک فرد عندلیب گھرانے کے اس غم میں برابر کا شریک ہے۔

مرحوم ڈاکٹر محمد اکرم مرزا' بزم طلوع اسلام جلال پور جٹاں کے نمائندہ اور طلوع اسلام ٹرسٹ کے رکن تھے۔ تحریک کی ترویج کے لئے مالی ایثار اور دو ٹوک فیصلے کرنے میں ان کا نام ہمیشہ یاد رکھا جائیگا۔ فکر قرآن کے شیدائی اور علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیرینہ ساتھی ہونے کے علاوہ ایک معروف ڈاکٹر بھی تھے۔ اپنی زندگی میں انہوں نے دو ہسپتال قائم کئے' ایک جلال پور جٹاں میں اور دوسرا گجرات میں۔ ان کی وفات پر اہالیان جلال پور جٹاں و گجرات کے علاوہ تحریک طلوع اسلام بھی ناقابل تلافی نقصان سے دوچار ہوئی ہے۔

مالک یوم الدین اپنی کتاب عظیم کے ان شیدائیوں کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

ادارہ طلوع اسلام

PAMPHLETS بمفلٹس

آرٹ پیپر کور (ART PAPER COVER) سے مزین کتابی سائیز میں' درج ذیل پمفلٹس' بحساب 3 روپے فی پمفلٹ (علاوہ ڈاک خرچ) ادارہ ہذا اور بزمہائے طلوع اسلام کے دفاتر سے دستیاب ہیں۔

قارئین نوٹ فرمالیں۔

ENGLISH

1. Genesis and Ideology of Pakistan.
2. Economics in the Social Structure of Islam.
3. Is Islam a Failure?
4. Islamic Ideology.

اردو

1- اسلامی قوانین کے راستے میں کون حائل ہے۔
2- اسلامک آئیڈیالوجی۔
3- کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟
4- رحمتہ للعالمینؐ
5- دنیا نظام محمدیؐ کے لئے بیتاب ہے۔
6- کیا ہم آزاد ہیں۔

ادارہ کا مقصد و مسلک (تازہ ایڈیشن) خریداران کو مفت فراہم کیا جائیگا۔

چیئرمین ادارہ

پاکستان میں
علامہ غلام احمد پرویزؒ
کا درسِ قرآنِ کریم مندرجہ ذیل مقامات پر ہوتا ہے

شہر	مقام	دن	وقت
1- ایبٹ آباد	595 کے۔ ایل کیمل۔ رابطہ: شیخ صلاح الدین	جمعتہ المبارک	10 بجے صبح
2- بورے والا	برمکان محمد اسلم صابر۔ مرضی پورہ گلی نمبر 5۔ رابطہ فون: 2438	پہلا اور تیسرا جمعہ	9 بجے صبح
3- پشاور	دفتر جناب عبداللہ ثانی صاحب ایڈووکیٹ۔ کابلی بازار۔ رابطہ: 270737	ہر بدھ و جمعہ	5 بجے شام
4- پشاور	برمکان ابن امین فقیر آباد	جمعتہ المبارک	4 بجے شام
5- پیر محل	مکان نمبر 140/139۔ مدینہ پارک	ہر ماہ پہلا جمعہ	9 بجے صبح
6- پنج کسی	برمطب حکیم احمد دین	جمعتہ المبارک	3 بجے سہ پہر
7- جہلم	برمکان محترم قمر پرویز مجاہد آباد، جی۔ ٹی روڈ	جمعتہ المبارک	6 بجے شام
8- جلالپور جٹاں	یونائیٹڈ مسلم ہسپتال	جمعرات	10 بجے صبح
9- چنیوٹ	ڈیرہ میاں احسان الٰہی کونسلر بلدیہ پیر ہٹہ بازار	جمعتہ المبارک	بعد نماز جمعہ
10- چک 215 ای۔ بی	برمکان چوہدری عبدالحمید	جمعتہ المبارک	8 بجے صبح
11- حیدر آباد	گولڈن سینٹری، عثمان آباد	جمعتہ المبارک	10 بجے صبح
12- حیدر آباد	B-12 قاسم آباد بالمقابل نسیم نگر	جمعتہ المبارک	بعد نماز عصر
13- ڈی۔ جی خان	مدینہ ٹائپنگ کالج، بلاک 2۔ کچہری روڈ	جمعتہ المبارک	10 بجے صبح
14- رجانہ	برمکان چوہدری ایس۔ ایم صادق، مین بازار	ہر ماہ تیسرا جمعہ	10 بجے صبح
15- راولپنڈی	بمقام E-4385/47 اپر سٹوری ہائی وے آٹوز نزد پل لئی گوالمنڈی راولپنڈی فون: 74752	جمعتہ المبارک	4-30 بجے شام
16- سرگودھا	60- اے سول لائنز، ریلوے روڈ۔ رابطہ فون: 720083	جمعتہ المبارک	9 بجے صبح
17- سیالکوٹ	محمد افضل خلجی، ایبٹ روڈ۔ رابطہ فون: 87658	پہلا اور دوسرا جمعہ	10 بجے صبح

شہر	مقام	دن	وقت
18- فیصل آباد	23- سی پیپلز کالونی (نزد تیزاب مل) رابطہ: ڈاکٹر محمد حیات ملک۔ فون۔ 42855	ہر جمعۃ المبارک	3-30 بجے شام
19- کراچی	چمن زاہد 19- بی بلاک 13- ڈی گلشن اقبال مقابل اردو سائنس کالج رابطہ خالد گل فون: 539798	جمعۃ المبارک	9-30 بجے صبح
20- کراچی	مکان 16 گلشن مارکیٹ' C/36 امریا کورنگی 5 رابطہ: محمد سرور' فون: 312631	جمعۃ المبارک	11-30 بجے صبح
21- کراچی	مکان E-282 قصہ کالونی نزد لودھی ہاؤس رابطہ: ڈاکٹر اسلم نوید۔ فون: 6660578	جمعۃ المبارک	4 بجے سہ پہر
22- کراچی صدر	فاروق ہوٹل ہال۔ ایاز حسین انصاری رابطہ فون: 4571919	جمعۃ المبارک	10 بجے صبح
23- کراچی	مکان 1206- گلی 10- اے' بی 36' شریف کالونی۔ لانڈھی رابطہ: لطیف' فون: 310316	اتوار	8 بجے شب
24- کوہاٹ	برمکان شیر محمد' نزد جناح لائبریری	جمعۃ المبارک	8 بجے صبح
25- گوجرانوالہ	شوکت نرسری گل روڈ' سول لائنز	جمعۃ المبارک	بعد از نماز جمعہ
26- گجرات	مرزا ہسپتال' کچہری روڈ	جمعرات	3 بجے
27- لاہور	25- بی گلبرگ II (نزد مین مارکیٹ)	جمعۃ المبارک	9-30 بجے صبح
28- لیہ	رحمانیہ میڈیکل سنٹر	جمعۃ المبارک	بعد نماز مغرب
29- ملتان	شاہ سنز بیرون پاک گیٹ	جمعۃ المبارک	11 بجے صبح
30- ماموں کانجن	برمکان ڈاکٹر (ہومیو) محمد اقبال عامر چک 509 گ ب	جمعۃ المبارک	بعد نماز جمعہ

علامہ غلام احمد پرویزؒ کی جملہ تصانیف اور ماہنامہ طلوع اسلام کا تازہ شمارہ بھی دستیاب ہے۔

تحریک طلوع اسلام سے متعلق استفسارات مندرجہ بالا مقامات پر موجود کارکنان تحریک کے حوالہ کیجئے۔

جواب ادارہ سے براہ راست دیا جائیگا۔

DARS-E-QURAN

(Recorded Lectures of Allama Parwez (r)
BOOKS AND MAGAZINE TOLU-E-ISLAM ARE ALSO
AVAILABLE AT THE FOLLOWING PLACES.

1.	**CANADA** 716 The West Mall,Suit 1804 Etobicoke, ONT (416) 620-4471	First Sun 11AM
2.	**DENMARK** Nattergaleveg 98, St Tv., 2400 Copenhagen NV	Last Sat 2 PM
3.	**Kuwait** Flat No. 6, Floor No. 3 Taher Bu Hamad Building Oppsite Al-Othman Mosque, Hawally, Kuwait	Friday 5.PM
4.	**NORWAY** Akeberg Veien-56, Oslo-6 Galgeberg, 4th floor	1st Sun 4PM
5.	**UNITED KINGDIM**	
(i)	**Birmingham** 229 Alum Rock Road	Sunday 3PM
(ii)	**London** 76 Park Road Ilford Essex Phone 081-553-1896	1st Sun 2:30PM
(iii)	**Yardley** 633 Church Road, Yardley, Birmingham B33 8HA (Phone 021-628-3718)	Last Sun 2PM
(iv)	**Essex** 50 Arlington Road, Southend-on-Sea ESSEX SS2 4UW, Phone 0702-618819	2nd Sun 3PM
(v)	**Yorkshire** Cardigan Community Centre 145-49 Cardigan Road LEEDS-6 Contact M. Afzal Phone 0532-306140	1st Sun 3PM

ON AIR

Dars-e-Quran on TV-9
Oslo (NORWAY)

Thursday
21:00PM

which was to be a novel and different experience in the history of mankind, of course, after the first period of Islamic history. She summarises the significance of this achievement on page 124 in the following words:-

> "The creation of Pakistan has caused a crack in the edifice of nationalism and no matter what vicissitudes, Pakistan may undergo, it will, one day be remembered by world posterity as one of the earliest concrete challenges to geographical, racial and lingual nationalism and the first step in this century, however small, towards a global home for the human family."

This book encased in a beautiful multi-colour graphic depiction of the Pakistan Idea, encompasses briefly almost every step of the movement of the Muslim community of Indian Sub-continent, towards materializing the import of the idea, and is a valuable treatise for the students of history and general public.

Mohammad Omar Draz

FREE SUPPLY OF MAGAZINE TO LIBRARIES CAN BE CONTINNUED

PROVIDED

YOU PAY IN GIFT FUND

PLEASE CONTRIBUTE LIBERALLY

BOOK REVIEW

Name of Book	The Pakistan Idea (A challenge to Geographical, Racial and Lingual Nationalism.)
Author:	M. Shamim Anwar
Publishers:	Tolu-e-Islam Trust 25B, Gulberg-2, Lahore
Printers:	Annoor Printers & Publishers.
Price:	Rs. 100 (Paper back)

The author, with a life long experience of teaching in history is a devoted student of the holy Quran. She carries a deep insight of the efforts for Muslim renaissance in Indo-Pakistan Sub-continent and in this study has carefully and meticulously traced the various stages of Muslim awakening in India and revival of the Two-Nation Theory, advocated by the holy Quran, in the form of Pakistan Idea. She writes on page 122 of the book:

> "The Pakistan idea emerged as a challenge to geographical nationalism. It was an attempt to solve the human tangle by experimenting an alternative to the prevalent systems".

This idea proved to be an assembling force for the sorrowfully divided Muslims of India under the leadership of Quaid-e-Azam Muhammad Ali Jinnah(r) and soon , over a brief period of about nine years (thanks to the honest genius of its leader) it culminated in the emergence of a new state on the world map by the name of Pakistan,

حقیقت حسن

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا
جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا

ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا
شب دراز عدم کا فسانہ ہے دنیا

ہوئی ہے رنگ تغیر سے جب نمود اسکی
وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جسکی

کہیں قریب تھا' یہ گفتگو قمر نے سنی
فلک پہ عام ہوئی' اختر سحر نے سنی

سحر نے تارے سے سنکر سنائی شبنم کو
فلک کی بات بتا دی زمیں کے محرم کو

بھر آئے پھول کے آنسو پیام شبنم سے
کلی کا ننھا سا دل خون ہو گیا غم سے

چمن سے روتا ہوا موسم بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا' سوگوار گیا!

(اقبالؒ)

FOR ENGLISH TRANSLATION

"حقیقت حسن" کا انگریزی میں مفہوم

Beauty's Essence

Beauty asked God one day

This question: 'Why

Didst Thou not make me, in Thy world, undying?'

And God replying ____

'A picture-show is this world: all this world

A tale out of the long night of not-being:

And in it, seeing

Its nature works through mutability,

That only is lovely whose essence knows decay,'

The moon stood near and heard this colloquy,

The words took wing about the sky

And reached the morning-star

Dawn learned them from its star, and told the dew___

It told the heavens' whisper to

Earth's poor familiar;

And at the dew's report the flower's eye filled,

With pain the new bud's tiny heartbeat thrilled;

Springtime fled from the garden, weeping;

Youth, that had come to wander there, went creeping

Sadly away.

(Contributed by IZAZ D.A. KHAN)

Corrigendum:
Article "What after dooms day" Published in Jan 95.
Page 75 for "RAHIMIYYAT" please read "Rahmaniyyat"
Very soory for such a gross error.

Mark again that fasting is not a mere rite. Its purpose is to enable you to establish on the one hand supremacy of the Divine laws in the world, in the light of the Guidance given to you (9/33) and on the other enable you to nourish your own potentialities.

In the context of the obligation to fast, do not think that by restricting the fulfilling of human needs to prescribed times and by abstaining from material indulgences, one is attaining closeness to Allah (as was believed to be the case amongst monastic cults). (O Rasool!) when My devotees ask you about Me, tell them that I am close to them at all times. (This means that) when anyone calls upon Me to lead him to the right path, My guidance which is preserved in the Qur'an, answers his call. Therefore, tell them that the way to attain the nearness of Allah is to adhere to My laws fully, believing implicitly in their validity (7/56, 8/24, 32/15-16, 40/60, 42/26). By following these laws they will be able to walk firmly upon the right path of life.

Take note that fasting is only from dawn to dusk. During other hours, eating, drinking or having sexual intercourse with one's wife is not prohibited. The relationship between the two spouses is a most intimate one. Monasticism engendered the concept that celibacy is a means of attaining closeness to Allah, but He is well aware of the importance of the intimate relationship between spouses in fulfilling human needs, and also the perversion, fantasies and self-deception to which renunciation of marital relationships lead (57/21)). Human beings may set unnatural limits upon themselves, but Allah's law rising above such limits, dispels your doubts and anxieties and makes it clear that in the hours from dusk to dawn you are permitted to cohabit with your wives, as well as partake of food and drink. From dawn to dusk you are required to fast. If after dusk you are detained at your centre (of training or activity e.g. Masjid) in order to ponder or resolve some important issue or problem, then you should devote your total attention to the task in hand and refrain from going home.

These are the laws laid down by Allah regarding matters which have been discussed above. You should adhere to them. Allah explains His laws clearly so that people can fully understand and follow them.

FASTING

Self-control is a pre-requisite both for steadfastness and fortitude in the battlefield as well as for establishing a just and equitable socio-economic system. In other words, in case of a conflict between your physical drives and lofty human values, you should uphold the latter. Furthermore, you should habituate yourself to leading a hard and laborious life. For this purpose fasting has been made obligatory for you as it was for earlier communities, in order that you may live according to the Divine laws and protect yourself from the pitfalls of life. Fasting is for a prescribed number of days. (Fixation of time itself is an aid to disciplined life). If (during Ramadan) any of you is sick or on a journey (and misses some fasts) he must complete the prescribed number by fasting on other days. But if a person is neither sick nor on a journey yet cannot fast except with great hardship and, therefore, cannot make up missed fasts, he should provide food for a person in need in lieu thereof.

It is evident that the condition of the last named category of persons cannot be determined by law. It is for you yourself to determine if you are unable to fast except with great hardship. If on assessing your own condition you conclude that the odds are even, then it is better for you to fast even if it is (relatively) Hard for you, because the purpose which is served by fasting cannot be attained by providing food to another-provided you understand the rationale for fasting.

Here the question arises as to why the month of Ramadan was chosen for this collective (as well as individual) exercise in self-discipline. The answer is that Ramadan is the month during which the revelation of the Qur'an began which shows all humanity the clear path leading to its ultimate goal, revealing those permanent values whereby one can distinguish truth from falsehood. The discipline learned through fasting is an annual training to remain in a state of preparedness for the accomplishment of this lofty programme. Hence a person who is at home during this month should fast. If a person is sick or on a journey, he should as already stated, complete the prescribed number of fasts by fasting on other days (and the concession allowed to a person who cannot fast except with great hardship has been mentioned earlier) Allah wants to make things easy for you and does not want to subject you to hardships and difficulties.